منشی نجم الدین کا بہت دلچسپ حال ڈاکٹر مختار الدین احمد آرزو نے تحریر کیا ہے، جو مولانا شبلیؒ کے توسط سے سرسید سے متوسل ہوئے اور ان کے مسودے نقل کرتے تھے، اور پھر ہر دم کے ان کے رفیق اور مصاحب بن گئے تھے، اس نمبر کا ایک مضمون سرسید کے ان مخالفین کے ذکر پر مشتمل ہے، جنھوں نے ان کی تفسیق و تکفیر کی، ان میں سرفہرست حاجی امداد العلی تھے، ناموروں پر جو مضامین شائع کئے گئے ہیں، ان میں بھی بعض تو سرسید کی تحریک میں شروع میں پیش پیش رہے مگر بعد میں وہ ان سے اختلاف کی وجہ سے علحدہ ہوگئے، مقالہ نگاروں نے ان اختلافات پر غیر جانبداری کے ساتھ روشنی ڈالی ہے، مولانا شبلیؒ پر ڈاکٹر سید محمد ہاشم کا مضمون بڑی حد تک متوازن ہے، لیکن پروفیسر خورشید الاسلام کے مضمون میں متضاد و مضحکہ خیز باتوں کے علاوہ مولانا شبلیؒ اور مذہب اسلام کا استخفاف بھی ہے، ان دو ایک گنتی کے مضامین کو چھوڑ کر یہ پورا نمبر مفید، سبق آموز اور دلچسپ مضامین پر مشتمل ہے، اس سلسلہ کی اشاعت ایک مفید قومی و ملی خدمت ہے، جن اشخاص پر مضامین شائع کئے گئے ہیں، ان کے فوٹو اور نشان خط کے نمونے بھی دئے گئے ہیں۔

ماہنامہ طیب شاہ نمبر ۱۔ مرتبہ جناب نسیم اختر شاہ قیصر، تقطیع کلاں، کاغذ، کتابت و طباعت قدرے بہتر، صفحات ۲۰۴، قیمت ۱۰ روپے، سالانہ چندہ ۲۰ روپے پتہ ماہنامہ طیب دیوبند، ۲۴۷۵۵۴،

مولانا سید محمد ازہر شاہ قیصر مشہور محدث مولانا انور شاہ کشمیری کے فرزند اکبر اور ماہنامہ دار العلوم دیوبند کے مدیر تھے، وفات سے کچھ پہلے انھوں نے ماہنامہ طیب بھی نکالا تھا، جو اب انکے صاحبزادے مولوی نسیم اختر شاہ قیصر کی ادارت میں شائع ہو رہا ہے، یہ خاص نمبر مرحوم کی یاد میں شائع کیا گیا ہے، جو ان پر مضامین اور نظموں کے علاوہ تعزیتی خطوط اور جرائد و رسائل کی خبروں اور تاثراتی تحریروں پر مشتمل ہے، گو مضامین و منظومات کا معیار بلند نہیں ہے، تاہم ان سے ایک حد تک مرحوم کی خوبیوں اور کمالات کا پتہ چلتا ہے، اگر ان کے چھوٹے بھائی، مولانا انظر شاہ، ان کے حالات و سوانح پر کوئی مبسوط مقالہ تحریر فرما دیتے تو اس سے اس نمبر کی قدر و قیمت بڑھ جاتی۔

"ض"

جلد ۱۳۹ ماہ جمادی الاخریٰ ۱۴۰۷ھ مطابق ماہ فروری ۱۹۸۷ء عدد ۲

مضامین

شذرات

اس سال ۲۶ جنوری کو یوم جمہوریہ کی سالانہ تقریب بہت دھوم اور فوجی تزک و احتشام کے ساتھ منائی گئی، جس کو دیکھ کر ملک کا ہر شہری محظوظ ہوا۔

اس تقریب سے ایک رات پہلے صدر جمہوریہ جناب گیانی ذیل سنگھ نے قوم کے نام پیام دیا، اس میں فرمایا کہ ملک کی سیکولرزم خطرہ میں ہے، اسی کے ساتھ یہ بھی کہا کہ انصاف، مساوات اور آزادی کا تقاضا یہ ہو کہ اس ملک میں سارے مذاہب ترقی پائیں، سارے کلچر پھلے پھولیں تاکہ ہم لوگ ایک ملک کی ایک قوم بن کر رہیں، اس پیام پر بہت ٹھنڈے دل سے غور کرنے کی ضرورت ہے، یہ ایک تاریخی حقیقت ہو کہ یہ ملک شروع سے اختلاف و نفاق میں مبتلا رہا، اسی لیے مختلف حصوں میں منقسم بھی ہوتا رہا، سرجدوناتھ سرکار نے اپنی ہسٹری آف اورنگ زیب میں یہ تسلیم کیا ہے کہ سب سے پہلی دفعہ اورنگ زیب نے اس کو جغرافیائی وحدت اس طرح عطا کی کہ اس کا ایک پرچم کشمیر سے راس کماری تک لہراتا نظر آیا، مگر اس کی وفات کے بعد راجپوتوں اور مرہٹوں نے اپنی علاحدہ علاحدہ علاقائی حکومتیں قائم کرکے اس کی وحدت کو زائل کیا، انگریزوں نے اپنے سامراجی مقاصد کی تکمیل کے لیے اس کی وحدت کو پھر سے قائم کیا، مگر تاریخ کا فیصلہ یہ ہوا کہ ان کے بعد برما، پاکستان، سری لنکا اور بھوٹان بھی علاحدہ ہو گئے، تاریخ کے بعض فیصلے بڑے ظالمانہ ہوتے ہیں، لیکن ان کو تسلیم کرنے کے علاوہ کوئی چارہ بھی نہیں ہی، مگر تاریخ از سرنو بھی بنائی جا سکتی ہو بشرطیکہ صحیح قسم کے فہم و ادراک سے کام لیا جائے۔

اسوقت ہمارے ملک کے جو حدود اربعہ رہ گئے ہیں ان کی یک جہتی اور سالمیت کی خاطر پورے تدبر، دوراندیشی اور انجام بینی کو بروئے کار لانا نہایت ضروری ہی، یہاں مختلف مذاہب، کلچر اور تمدن ضرور ہیں مگر اس نیرنگی میں فکر و نظر کی خوش رنگی ہو تو اس میں یک رنگی کا پیدا ہونا مشکل نہیں، اس کی مذہبی، تہذیبی، ثقافتی اور تمدنی زندگی کی قوس قزح میں جو رنگا رنگی ہے وہی اس کی دیدہ زیبی، رعنائی اور دلآویزی کی ضمانت ہے، اس ملک کے مختلف مذہبی گروہوں

کے جو پرسنل لا ہیں ان کو بھی اسی زاویۂ نگاہ سے دیکھنے کی ضرورت ہے۔

اگر قوت اور اقتدار کے غرور اور پندار میں یا محض راج ہٹ سے یکساں سول کوڈ بنایا گیا تو سوچنے کی بات ہے کہ اس سے جذباتی ہم آہنگی، قومی یک جہتی اور بقائے باہمی یا آزردگی، بیزاری اور دل خراشی کی فضا پیدا ہوگی، جبر و دستی اور زبردستی سے یگانگت اور موانست پیدا نہیں کی جاسکتی، بلکہ یہ نفرت اور کدورت کو جنم دیتی ہے، محبت کی شمیم انگیزی اور عطر پاشی سے نہ صرف دلوں کو معطر اور نکہت بیز کیا جاتا ہے، بلکہ ان کو مسخر اور مغلوب بھی کر لیا جاتا ہے، ہمارے موجودہ ارباب حکومت کی اسی میں آزمائش ہے کہ اپنی زیرکی، ہوشمندی اور انجام بینی کی بوئے گل کو کس طرح کی نسیم جانفزا سے پھیلانے کی کوشش کرتے ہیں۔

خود مسلمانوں کا ایک تھوڑا سا گروہ ایسا بھی ہے، جو مسلمانوں کے سواد اعظم کی ہر تحریک کی مخالفت کرکے اپنی وطن دوستی اور روشن ضمیری کا ثبوت دینا چاہتا ہے، مگر اس تھوڑے سے گروہ میں ایسے نام نہاد مسلمان ہوتے ہیں جو مسلمانوں کی مذہبی، تہذیبی اور تمدنی زندگی سے بالکل بیگانہ رہتے ہیں، لیکن ذاتی اور عارضی جلب منفعت کی خاطر مسلمانوں کی رائے عامہ کی مخالفت کرکے ان کے وکیل بن جاتے ہیں اور یہ ظاہر کرنا چاہتے ہیں کہ وہی ان کے اصلی نگہبان اور دیدبان ہیں، حالانکہ وہ مسلمانوں کے تنومند جسم کے محض کینسر اور ناسور ہوتے ہیں، تجربہ یہ ہے کہ آخر میں ایسے مسلمان نہ تو حکومت اور نہ ہی مسلمانوں کے لیے مفید ہوئے ہیں۔

ایسے مسلمانوں کو وقتاً فوقتاً پیدا ہونے سے روکا بھی نہیں جاسکتا، مگر خود مسلمانوں کو اپنی دینی دعوت میں عزیمت دکھانا ہے، وہ اپنے پرسنل لا کو محفوظ رکھنا چاہتے ہیں، تو وہ اس کو جلسے جلوس، آتش فشاں تقریریں اور وقتی ہنگاموں سے محفوظ نہیں رکھ سکتے، اس لیے تعمیری کاموں کو بروئے کار لانے کی ضرورت ہے، بہار میں امارت شرعیہ عرصہ سے قائم ہے اور خاموشی سے شریعت اور پرسنل لا کے تحفظ کی خاطر سرگرم عمل ہے، اگر اسی نمونہ کی تنظیم ہر ریاست میں قائم ہو جائے تو پھر حکومت کی دریوزہ گری کی ضرورت باقی نہ رہے گی، پرسنل لا میں نکاح و طلاق کا مسئلہ سب سے زیادہ اہم ہے، اس کو طے کرنے کے لیے امارت

شرعیہ کے ساتھ ایک دار القضاء کی تاسیس نہایت ضروری ہے۔ ۱۹۳۱ء میں نواب بھوپال نے علماء اور فقہاء کی مدد سے نکاح و طلاق کے اسلامی ضابطے اور قوانین مرتب کیے تھے، جو آج بھی غیر متنازعہ اور قابل قبول سمجھے جا سکتے ہیں، اگر دار القضا قائم ہو تو یہ ضابطے اور قوانین آسانی سے عمل میں لائے جا سکتے ہیں جن سے مسلمانوں کی دشواریاں اور پریشانیاں آسانی سے دور ہو سکتی ہیں، اللہ تبارک و تعالےٰ مسلمانوں میں سرگرم عمل ہونے کی توفیق عطا فرمائے

ہندوستانی مسلمانوں کو اپنے ملی وجود کو برقرار رکھنے کی طلب اور تمنا ہے تو ان کو اپنے عروج و زوال کے اسباب پر بھی گہری نظر رکھنا چاہیے۔ وہ اپنی روزمرہ زندگی کے قول و فعل، لین دین، اور سیرت و کردار کا تجزیہ کرتے رہیں کہ کہیں ان پر کفر و شرک اور الحاد خندہ زن تو نہیں ہو رہا ہے۔ قرآن پاک میں ان کو یہ بشارت دی گئی ہے کہ وہ دنیا میں بہترین گروہ بن کر انسانوں کی اصلاح کے لیے میدان میں لائے گئے ہیں وہ نیکی کا حکم دیں، بدی کو روکتے رہیں، اور اللہ پر ایمان رکھتے رہیں، اگر اس پر ان کا عمل ہو جائے تو قرآن مجید کے ارشادات کے مطابق ان کا کوئی کچھ بگاڑ نہیں سکتا، زیادہ سے زیادہ بس اغیار کچھ ستا سکتے ہیں۔

عرصہ سے تقاضا تھا کہ حضرت مولانا سید سلیمان ندوی نے معارف میں ۱۹۱۶ء سے آخر دم تک جو شذرات لکھے ہیں۔ وہ علحدہ سے شائع کیے جائیں۔ تاکہ یہ قیمتی سرمایہ اہل ذوق کے ہاتھوں میں پہنچ جائے۔ الحمد للہ انکو دو جلدوں میں ترتیب دے دیا گیا ہے، پہلی جلد مارچ تک شائع ہو جائے گی۔ دوسری جلد زیر کتابت ہے، اسی کے ساتھ ان کے معاصر مشاہیر نے جو ان کو خطوط لکھے تھے وہ بھی زیر طبع ہیں۔

مقالات

مستشرق شاخت اور فقہ

از

(ڈاکٹر محمد انس زرقا و استاذ ملک عبد العزیز یونیورسٹی، جدہ)

ترجمہ:- محمد عارف اعظمی عمری

تمہید زیر نظر مقالہ میں اسلام کے مالیاتی نظام کی سب سے اہم بنیاد زکوٰۃ کے بارہ میں مستشرق جوزف شاخت کے شبہات و اعتراضات کا جائزہ لیا گیا ہے، زکوٰۃ کے تعارف میں شاخت کا یہ مقالہ انسائیکلوپیڈیا آف اسلام مطبوعہ ۱۹۳۴ء کی چوتھی جلد میں درج ہے۔ اصل مقالہ پر بحث و گفتگو سے پہلے جوزف شاخت کا مختصر تعارف پیش کیا جاتا ہے۔

جوزف شاخت ۱۹۰۲ء میں پیدا ہوئے جرمنی کی دو مشہور یونیورسٹیوں یعنی "برسلو" اور "لیپزیک" میں تعلیم حاصل کی، اقتصادیات کے موضوع پر متعدد مقالے لکھے، انھوں نے کئی کتابیں تصنیف کیں، فقہ کے موضوع پر بعض عربی کتابوں کے ترجمے بھی کئے؛ وہ انسائیکلوپیڈیا آف اسلام کے بورڈ کے ممبر بھی تھے، اور ۱۹۳۴ء تا ۱۹۳۹ء آکسفورڈ، لندن اور قاہرہ کی یونیورسٹیوں میں استاد رہے، اور ۱۹۵۵ء میں دمشق کی "مجمع اللغۃ العربیۃ" کے رکن نامزد ہوئے، ۱۹۶۹ء میں[1] ان کا انتقال ہوا۔

لفظ زکوٰۃ کی لغوی تحقیق سب سے پہلے جوزف شاخت نے اپنے اس مقالے میں متعدد مقامات پر لفظ

---

[1] Who Was Who 1961-70

"زکا" اور "صدقہ" کی لغوی تحقیق کی ہے، اور اس سے یہ باور کرانے کی کوشش کی ہے کہ اسلام میں زکاۃ کا مفہوم دراصل یہود کی ایک مذہبی تعبیر سے ماخوذ ہے، وہ لکھتے ہیں :-

"مسلم علماء عربی زبان کے لفظ "زکاۃ" کے لغوی معنی "طہارت اور اضافہ" بتاتے ہیں، عبرانی زبان میں ایک لفظ "زاکوت" ہے، اسی لفظ کو جناب محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اور زیادہ وسیع معنوں میں استعمال کیا ہے، اس کے معنی بھی طہارت اور پاکی کے ہیں۔"

۱۹۶۱ء میں شاخت کا یہ مقالہ اضافہ و ترمیم کے بعد شائع ہوا، اس میں انھوں نے اپنے مذکورۂ بالا خیالات کا اظہار یوں کیا ہے۔

"علم صرف و اشتقاق کی رو سے لفظ "زکوٰۃ" کی کوئی تاریخی بنیاد نہیں ہے، اب یہ عربی مفردات میں شمار ہونے لگا ہے، اسے رسول اللہ صلعم نے یہودیوں میں رائج آرامی لفظ "زکوت" سے اخذ کیا تھا، بعد میں وہ عربی زبان میں استعمال ہونے لگا۔"

جوزف شاخت کا یہ کہنا کہ "زاکوت" کے معنی "طہارت و پاکیزگی" کے ہیں، صحیح ہے، لیکن عربی زبان کے لفظ "زکوٰۃ" کے بارے میں ان کے خیالات صحیح نہیں ہیں، بلکہ گمراہ کن ہیں۔

سب سے پہلے اصولی طور پر یہ بات ذہن میں رہنی چاہئے کہ عبرانی، آرامی، عربی اور بابلی سامی الاصل زبانیں ہیں، اس حیثیت سے ان کے درمیان بعض لفظوں کا اشتراک ممکن ہی نہیں بلکہ متوقع اور قرین قیاس ہے، لیکن قطعی طور سے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ اصلاً کس زبان کے الفاظ ہیں، اور نہ ہی تاریخی طور پر یہ طے کیا جا سکتا ہے، کہ وہ کب اور کیسے دوسری زبانوں میں منتقل ہوئے، شاخت کا یہ کہنا کہ لفظ زکوٰۃ، عبرانی یا آرامی زبانوں سے ماخوذ ہے، یہ ان کا ایک فرضی خیال ہے، اور ایسا دعویٰ ہے، جس کی کوئی دلیل نہیں، یہودی عالموں کی یہ عادت ہے کہ وہ ہمیشہ سامی الاصل زبانوں میں کسی بھی مشترک لفظ کو عبرانی کے سوا کسی دوسری زبان سے ماخوذ

قرار دینا نہیں پسند کرتے۔ اس سلسلہ میں شاخت کا رویہ بھی ان ہی کے مطابق ہے، کیا کسی زبان میں ایک کلمہ یا لفظ کا وجود اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ ابتدا ہی سے اس زبان کا لفظ ہے، یہ صحیح ہے کہ عربی زبان کی تالیف و تدوین عہد رسالت ؐ سے شروع ہوئی، لیکن اس کی سینکڑوں برس کی قدیم تاریخ واقعات و قصص اور اشعار و خطبات میں محفوظ رہی۔

اگر ہم یہ تسلیم بھی کر لیں کہ لفظ "زکوٰۃ" عبرانی یا آرامی ہی سے عربی میں منتقل ہوا ہے، تب بھی یہ ماننا ہوگا کہ یہ لفظ اسلام سے پہلے عربی زبان میں داخل ہو چکا تھا، اس صورت میں یہ دعویٰ کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلی بار اس لفظ کو یہودیوں سے لیا ہے، کیسے صحیح ہو سکتا ہے۔[51]

پھر عبرانی اور آرامی میں "زاکوت" کے معنی صرف پاکی، برارت، حق اور کمائی کے ہیں، ان تمام معانی میں کسی ایک سے بھی کسی دینی فریضہ کی طرف کوئی اشارہ نہیں ملتا جب کہ اسلام میں لفظ "زکوٰۃ" سے ایک مکمل دینی فریضہ مراد لیا جاتا ہے۔ جس کے اپنے اصول و ضوابط ہیں۔

اسی طرح شاخت کا یہ دعویٰ کہ لفظ "زکوٰۃ" کی علم تصریف و اشتقاق میں کوئی بنیاد نہیں ہے، صحیح نہیں ہے، اگر صرف ابن منظور کی لسان العرب ہی کو دیکھ لیا جائے تو اس بلند بانگ دعویٰ کی قلعی کھل جائے گی۔

ابن منظور لکھتے ہیں :"الزکاۃ" زکا، یزکو کا مصدر ہے۔ اس کے معنی نمو، برکت، طہارت، صلاح اور تعریف کے ہیں، کہا جاتا ہے، زکّیٰ نفسہ یعنی اس نے اپنے کو پاک قرار دیا۔

اسلام نے لفظ "زکوٰۃ" کو معروف اصطلاحی معنی کے علاوہ مذکورۂ بالا تمام لغوی معنوں میں بھی استعمال کیا ہے، اور یہ تمام معانی عربی کے دیگر الفاظ کی طرح منطقی تدریج سے گذر کر

---

[51] حاشیہ بر مقالہ شاخت انسائیکلوپیڈیا آف اسلام (عربی ترجمہ)، از ڈاکٹر مہدی علام جلد ۱۰ ص ۳۵۶ [52] لسان العرب، مادہ زکا۔

اس صورت تک پہونچے ہیں۔ یعنی "زکوٰۃ" کے حسی معنی (نمو) سے مجازی معنی، برکت، طہارت، اصلاح اور تعریف پیدا ہوئے، پھر اسی سے زکوٰۃ کا یہ لفظ فقہی اصطلاح کے طور پر استعمال کیا جانے لگا۔ یہ لفظ عربی زبان کے لیے نیا نہیں بلکہ نہایت قدیم ہے۔

اور اگر مزید غور و فکر کیا جائے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ عربی مفردات میں حروف (زک) سے شروع ہونے والے تمام ثلاثی مادّے بالعموم پُر ہونے اور کثیر ہونے کے معنی میں آتے ہیں، مادے کے تیسرے حرف سے اس عام مفہوم کی تعیین و تحدید ہوتی ہے، مثلاً حروف (زک) سے مشتق آٹھ صیغے ہیں

۱۔ زکأ۔ اس کا تیسرا حرف ہمزہ ہے، اس کے معنی ہیں. کثیر النقد، حاضر (مالدار) اور نقدی جلد ادا کر دینے والا۔

۲۔ زکب، الإناء۔ ملأہ۔ برتن بھرنا۔

۳۔ زکت، الأناء۔ ملأہ۔ " "

۴۔ زکر الإناء۔ ملأہ۔ برتن بھرنا۔ الزکرۃ۔ مشکیزہ۔

۵۔ زکّ الرجل۔ زکّاً و زکیکاً۔ قریب قریب قدموں کو رکھنا اور ان کو چلنے کے دوران بہت اوپر اور نیچے کی طرف لے جانا۔ اس سے قدموں کی تیزی اور سرعت مراد ہے۔

زکّ القربۃ۔ ملأھا۔ مشکیزہ بھرنا۔

۶۔ زکم الرجل۔ زکام زدہ ہونا۔ یہ الزکمۃ سے ماخوذ ہے۔ اس کے معنی بھی بھرنے کے

۷۔ زکن۔ زکناً و زکانۃ۔ کان ذا فطنۃ و حدس۔ بہت ہوشیار و چالاک ہونا۔ تاڑ لینا۔ سمجھ لینا۔

۸۔ زکا۔ یزکو۔ اس کے معنی اوپر گزر چکے ہیں۔

ابن منظور نے مذکورہ بالا تمام صیغوں کی تشریح اور ان کے مشتقات کی تخریج کے علاوہ ان کی متعدد نظیریں اور مثالیں بھی بیان کی ہیں، اس طرح سے یہ لفظ زکوٰۃ اپنے معنی میں منفرد اور یگانہ نہیں ہے بلکہ حروف (زک) سے مشتق الفاظ کے ایک بہت بڑے سلسلہ سے وابستہ ہے جس میں کثرت کا عمومی مفہوم پایا جاتا ہے۔ کسی بھی زبان کے اصیل الفاظ کی یہی علامتیں اور نشانیاں ہیں، جب کہ غیر زبان سے ماخوذ کلمات عموماً جامد ہوتے ہیں اور دوسرے الفاظ سے ہم آہنگ ہونے کے بجائے اپنی انفرادی حیثیت رکھتے ہیں، اور اگر ان سے بعض الفاظ مشتق بھی ہوتے ہیں، تو ان کی تعداد بہت کم ہوتی ہے۔

زکوٰۃ کے ارتقائی مراحل

زکوٰۃ کے سلسلہ میں جوزف شاخت کے مقالے کا دوسرا اہم جزء یہ ہے کہ اسلام میں زکاۃ بیک وقت نافذ نہیں ہوئی، بلکہ اس نے رفتہ رفتہ ارتقائی مراحل طے کر کے ایک مکمل نظام کی حیثیت اختیار کی ہے، وہ لکھتے ہیں:۔

"مکی سورتوں میں (زکا) کے مادہ سے مشتق تمام صیغوں کے معنی صرف تقوی کے ہیں، ان میں طہارت، پاکیزگی اور اصلاح نفس کے بجائے عطا و بخشش کا مفہوم مدینہ منورہ میں رائج ہوا، وہ اس طرح کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہودیوں سے اس لفظ کے اور وسیع تر معانی سے واقفیت حاصل کی اور اسکے متعلق معلومات مدینہ منورہ کے یہودیوں سے سیکھیں، چنانچہ مدینہ میں لفظ زکاۃ، صدقہ کے مرادف ہو گیا، یہی وجہ تھی کہ مکہ میں زکاۃ مسلمانوں کی مرضی اور اختیار سے وصول کی جاتی رہی لیکن مدینہ منورہ میں باقاعدہ اس کا نظم و انصرام ہوا، اور وہ غیر اختیاری طور پر جبریہ وصول کی جانے لگی"۔

جوزف شاخت کا خیال ہے کہ اسلام کے ابتدائی عہد یعنی مکی دور میں لفظ "زکوٰۃ"

صرف تقوی اور طہارت کے معنی میں معروف تھا ایتاء مال یعنی زکوۃ دینے یا مال خرچ کرنے کے معنی میں اس کا استعمال نہیں ہوا، یہ خیال بالکل بے بنیاد ہے، قرآن مجید میں متعدد مقامات پر یہ لفظ مکی عہد میں بھی طہارت و پاکیزگی اور تقوی کے ساتھ ایتاء مال کے معنی میں استعمال ہوا ہے، ملاحظہ ہو۔ سورہ روم ۳۹۔ سورہ فصلت ۶-۷۔ سورہ لقمان ۴۔ سورہ النمل ۱-۳۔ یہ تمام سورتیں مکہ مکرمہ میں نازل ہوئی ہیں۔

جوزف شاخت نے اپنے اس خیال کو کئی جگہ دہرایا ہے، اور وہ ہر بار یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ اسلام میں زکاۃ کا مفہوم یہودیت سے لیا گیا ہے، حالانکہ ان مذاہب میں زکاۃ کے مفہوم کے تقابلی جائزہ سے شاخت کا یہ خیال غلط ثابت ہوتا ہے،

تینوں آسمانی مذاہب (اسلام، نصرانیت اور یہودیت) میں فقراء اور متعدد لوگوں کی مدد ان کے ساتھ حسن سلوک اور صدقہ و خیرات کی ترغیب پائی جاتی ہے، قرآن مجید کے علاوہ توراۃ وانجیل کے موجودہ نسخے بھی اس کی تائید کرتے ہیں، البتہ صدقات و خیرات اور حسن معاملات کا نہ کوئی متعین نصاب رکھا گیا ہے، اور نہ کوئی قطعی مقدار مقرر کی گئی، بلکہ افراد کی ایمانی حرارت، نیکی اور تقوی اس کے پیمانے ہیں، اس کے برخلاف کچھ صدقات ایسے بھی ہیں جن کی ادائیگی لازمی ہے۔ یہ دو طرح کے ہیں۔ (۱) اسلام میں زکوۃ۔ (۲) دیگر مذاہب میں عُشر۔ لیکن ان دونوں میں بنیادی فرق یہ ہے کہ ثانی الذکر صرف مذہبی سربرآوردہ شخصیتوں مثلاً پوپ، پنڈت، پروہت اور ان کے خاندان کے افراد کے لئے یا بعض مذہبی روایات کی بجا آوری کے لئے وصول کیا جاتا رہا ہے گو اس کا کچھ حصہ مذہبی طبقہ کی طرف سے فقراء کو بھی دیدیا جاتا تھا، مگر یہ لازمی نہ تھا، اور نہ ہی اس کی مقدار متعین تھی جس پر عمل کیا جاتا رہا ہو، بعض مورخین کے بقول یورپ کے عہد وسطی تک فقراء اور معذوروں کو صدقہ میں دی جانے والی یہ رقم انتہائی معمولی اور حقیر ہوتی تھی اس کے

ا۔ عام شکل یہی تھی تاہم بعض مراجع سے یہ بھی اشارہ ملتا ہے کہ مسیحی کلیسا اپنی آمدنی کا ایک ربع فقراء کے لئے بطور صدقہ خاص کیا کرتا تھا، ملاحظہ ہو۔ ڈبلو۔ ٹی۔ سی۔ ڈی۔ اف۔ کا ... انسائیکلوپیڈیا آف ریلیجن اینڈ ایتھکس

برعکس مذہبی طبقہ نہایت عیش و عشرت کی زندگی بسر کرتا تھا، مسیحی اور یہودی دونوں کی کتب تاریخ سے اس کی تصدیق ہوتی ہے[1]

اس کے برخلاف اسلام میں زکاۃ کے اولین حقدار فقراء ہیں۔ زکاۃ و صدقات کی رقم نبی کریمؐ اور آپؐ کے اہل بیت اور علمائے دین پر حرام قرار دیدی گئی، طبقہ علماء میں سے اگر کوئی واقعی ضرورت مند ہو تو اس کو فقر و افلاس کی وجہ سے زکاۃ کی رقم دی جا سکتی ہے، ورنہ نہیں، یہ مال مساجد کی تعمیر کے لیے بھی استعمال نہیں کیا جا سکتا۔ جب کہ دیگر تمام مذاہب میں عشر پر دینی طبقہ ہی کا قبضہ و تصرف ہوتا ہے۔

جوزف شاخت نے اس اہم حقیقت کو نظر انداز کر کے زکاۃ اور زکوت کی لفظی بحث چھیڑ دی ہے، اور اسلام میں زکوۃ کی اہمیت، معاشرہ میں اس کے پاکیزہ اثرات اور اعلی انسانی و اخلاقی اصول کے اقرار کے بجائے اس کو یہودیت سے ماخوذ قرار دینے کی کوشش کی ہے، اور اس طرح اسلام کی ایک امتیازی خوبی کا سہرا یہود کی شریعت کے سر باندھنے کی سعی کی ہے۔

زکاۃ کا مصرف | مستحقین زکاۃ کا ذکر کرتے ہوئے جوزف شاخت لکھتا ہے۔

"قرآن مجید کی سورہ بقرہ کی آیت ۲۱۵ اور متعدد حدیثوں میں زکاۃ کے مستحقین کی فہرست درج ہے، جن میں والدین، اعزہ و اقارب، یتیم، فقراء، مسافر، سائل اور غلام شامل ہیں، مستحقین زکوۃ کی یہ فہرست ان لوگوں کی ہے، جن کے ساتھ نیکی اور حسن سلوک کی اہمیت واضح ہے، مگر سنت نبویؐ نے اس فہرست میں مالداروں، چوروں اور بدکار عورتوں کو بھی شامل کیا ہے۔"

ا۔ انسائیکلوپیڈیا جوڈیکا۔ مقالہ "تائیتھ جنرل" از ویشلر، ربارک ص ۱۱۵۶-۱۱۶۲۔ انسائیکلوپیڈیا آف ریلیجن اینڈ ایتھکس مقالہ "تائیتھ" از میک کلوچ۔ ص ۳۴۳-۳۵۰۔ کیتھولک انسائیکلوپیڈیا مقالہ تائیتھ از فیننگ ولیم ص ۷۴۱-۷۴۲۔ دی اگرارین سوشیالوجی دی اینشینٹ سیویلائزیشن۔ ص ۱۲۱ اور ۲۷۴۔ انسائیکلوپیڈیا آف ریلیجن اینڈ ایتھکس مقالہ "پریسٹ پرائس تھوڈ" از ہرٹیشفیلڈ۔

جوزف شاخت کی مذکورہ بالا رائے میں کئی باتیں غلط ہیں۔ اس نے مستحقین زکاۃ کی فہرست میں والدین کو بھی شمار کیا ہے، جو اجماع امت کے سراسر خلاف ہے، کیونکہ کسی بھی صاحبِ نصاب بیٹے پر اس کے والدین کا نان ونفقہ شرعاً واجب ہے، اس وجوب کی ادائیگی کے بعد اگر وہ ان کو زکاۃ کی رقم بھی دے جو گویا زائد از ضرورت ہے، تو وہ اپنے ہی کو زکاۃ دینے والا سمجھا جائیگا اسی طرح اولاد یا بیوی کو بھی زکاۃ دینا درست نہیں، کیونکہ ان کے نفقہ کا وہ ذمہ دار ہوتا ہے،

شاخت نے والدین اور اعزہ واقارب کو زکاۃ دیے جانے کے ثبوت میں سورہ بقرہ کی آیت ۲۱۵ اور چند حدیثوں کا حوالہ دیا ہے، یہ صحیح نہیں ہے، کیونکہ ان کا تعلق فریضۂ زکاۃ سے نہیں ہے، بلکہ انفاق وصدقات سے ہے۔

ان کا یہ خیال کہ "سنت نبویؐ نے اس فہرست میں مالداروں، چوروں اور بدکار عورتوں کو بھی شامل کیا ہے" بالکل ناواقفیت پر مبنی ہے، انھوں نے اس کی تائید میں ایک حدیث نقل کی ہے، گو انھوں نے اس کی صراحت نہیں کی ہے، کہ یہی حدیث اس کا ماخذ ہے تاہم ان کے الفاظ سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہی حدیث ان کا مرجع ہے، ہم اس حدیث کو نقل کرتے ہیں۔ اور جوزف شاخت کی علمی لیاقت اور قوت استنباط کا فیصلہ قارئین پر چھوڑتے ہیں۔

امام بخاریؒ، امام مسلمؒ اور امام نسائیؒ نے یہ حدیث حضرت ابوہریرہؓ کی سند سے نقل کی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:۔

قال رجل[1] لأتصدقن بصدقة	ایک شخص نے کہا، میں صدقہ کروں گا،
فخرج بصدقته فوضعها في يد سارق	چنانچہ وہ صدقہ کا مال لیکر نکلا اور
فأصبحوا يتحدثون تصدق	اس کو ایک چور کے ہاتھ میں دیدیا،

۱ امام احمد بن حنبلؒ اپنی مسند میں لکھتے ہیں کہ وہ شخص بنی اسرائیل میں سے تھا۔

على سارق، فقال اللهم	لوگ اس بارے میں گفتگو کرنے لگے کہ
لك الحمد على سارق لأتصدقن	چور کو صدقہ دیا گیا، اس نے کہا، اے اللہ
بصدقة، فخرج بصدقته	ایک چور کو صدقہ دینے پر بھی تیرے ہی لئے
فوضعها في يد زانية،	تعریف ہے[1]، میں صدقہ کروں گا چنانچہ
فأصبحوا يتحدثون تصدق	وہ صدقہ لیکر نکلا اور ایک زناکار عورت
الليلة على زانية، فقال اللهم	کو دیدیا، تو لوگ اس بارے میں گفتگو
لك الحمد على زانية لأتصدقن	کرنے لگے کہ آج ایک زناکار عورت
بصدقة، فخرج بصدقته	کو صدقہ دیدیا گیا، تو اس نے کہا اے
فوضعها في يد غني، فأصبحوا	میرے اللہ ایک زناکار عورت کو صدقہ
يتحدثون، تصدق على غني،	دینے پر تیرے ہی لئے تعریف ہے، میں
فقال اللهم لك الحمد على	صدقہ کروں گا، چنانچہ پھر وہ صدقہ
زانية وعلى سارق وعلى	کا مال لیکر نکلا اور ایک مالدار کو دیدیا
غني، فأتي فقيل له، اما	تو لوگ اس کے متعلق گفتگو کرنے لگے
صدقتك فقد تقبلت،	کہ ایک مالدار آدمی کو صدقہ دیا گیا
اما الزانية فلعلها تستعف	تو اس نے کہا اے میرے اللہ زناکار
به عن زناها، ولعل السارق	عورت، چور اور مالدار آدمی کو صدقہ دینے پر
ان يستعف به عن سرقته	تیرے ہی لیے تعریف ہے، چنانچہ اس نے

۱ حافظ ابن حجر کہتے ہیں کہ اس شخص نے اللہ کی حمد اس کے قضا وفیصلے کو برضا تسلیم کرتے ہوئے کی کیونکہ ہر حال میں اللہ کی تعریف کرنی چاہئے۔

ولعل الغنی ان یعتبر فینفق مما اعطاہ اللہ عزوجل۔	(خواب میں) دیکھا، اس سے کہا جا رہا تھا کہ تمہارا صدقہ مقبول ہوا کیونکہ زناکار عورت شاید زنا سے بچے، چور شاید چوری سے باز رہے، اور مالدار کو شاید عبرت ہو اور اس کو اللہ نے جو کچھ دیا ہے اس میں سے

امام بخاری اور امام نسائی نے یہ روایت "باب اذا تصدق علی غنی وھو لا یعلم [1]" یعنی جب کوئی کسی مالدار کو صدقہ دے اور وہ (اس کی مالداری کو) نہ جانتا ہو" کے ذیل میں درج کی ہیں، اسی بنیاد پر ابن حجرؒ نے یہ مفہوم لیا ہے کہ اگر صدقہ کرنے والے کی نیت درست ہے تو اس کا صدقہ مقبول ہوگا، خواہ وہ صحیح مصرف میں استعمال نہ ہوا ہو، لیکن یہ باتیں نفلی صدقات سے متعلق ہیں، فریضۂ زکاۃ میں اگر اس طرح کی بھول ہو گئی تو اس کا حکم الگ ہے، چنانچہ امام بخاریؒ اور ابن حجر یہ کہتے ہیں۔

لا دلالۃ فی الحدیث علی الاجزاء ولا علی المنع [2]۔	زکاۃ کی ادائیگی یا عدم ادائیگی کا اس حدیث میں کوئی ثبوت نہیں ہے۔

لیکن امام نوویؒ صحیح مسلم کی شرح میں لکھتے ہیں۔

وھذا فی صدقۃ التطوع واما الزکاۃ فلا یجزئ دفعھا الی غنی [3]۔	یہ نفلی صدقہ میں ہے، لیکن زکاۃ اگر کسی مالدار کو دی جائے تو وہ ادا نہیں ہوگی۔

---

[1] امام بخاریؒ اور امام نسائیؒ کے الفاظ تقریباً یکساں ہیں، یہاں نسائیؒ کے الفاظ نقل کئے گئے ہیں۔

[2] فتح الباری ج ۳ ص ۲۹۱ [3] صحیح مسلم ج ۱ ص ۳۳۹ کتاب الزکاۃ، باب ثبوت اجر المتصدق وان وقعت الصدقۃ فی ید فاسق۔

متعدد صحیح روایتوں سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے کہ مالدار کو قصداً زکاۃ نہیں دی جا سکتی، مثلاً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

لا تحل الصدقۃ لغنی ولا لذی مرۃ سوی [1]۔	صدقہ (زکاۃ) مالداروں اور توانا و تندرست لوگوں کے لیے حلال نہیں۔

اور فرمایا:-

لا حظ فیھا لغنی ولا لقوی مکتسب [2]۔	زکوٰۃ میں مالدار اور برسرروزگار تندرست شخص کا کوئی حصہ نہیں ہے۔

ائمہ مجتہدین میں بھی اس سلسلہ میں کوئی اختلاف نہیں ہے، البتہ اس میں اختلاف ہے، کہ کسی مالدار کو لاعلمی میں زکاۃ دیدی گئی، تو اس کی ادائیگی ہوئی یا نہیں؟

امام ابو حنیفہؒ کا مسلک ہے کہ زکاۃ ادا ہو گئی، اعادہ ضروری نہیں، کیونکہ زکاۃ ادا کرنیوالے نے اپنی حد تک مکمل چھان بین کر کے اس کے صحیح حقدار تک اس کو پہونچانے کی کوشش کی ہے۔ اس کے برخلاف امام شافعیؒ کہتے ہیں کہ دوبارہ زکوٰۃ ادا کرنی ہوگی، اور اسے مستحق تک پہونچانا ہوگا [3]۔

اگر بدکار عورت یا چور محتاج و فقیر ہوں یا مستحقین زکوٰۃ کی فہرست میں آتے ہوں تو ان کو زکوٰۃ دی جا سکتی ہے [4]، گو بعض علماء مثلاً امام غزالیؒ کی رائے کے مطابق ان کے بجائے دوسرے اہل خیر مستحقین کو دینا بہتر ہے [5]، مگر مندرجہ بالا حدیث کی روشنی میں یہ بات واضح ہے کہ اس قسم کے لوگوں کو زکوٰۃ دینے سے ان کے راہ راست پر آنے کی توقع ہے۔

---

[1] مسند احمد بن حنبل ج ۲ ص ۱۶۴ [2] مختصر تفسیر ابن کثیر، سورۃ توبہ آیت ۶۰ [3] فقہ الزکوٰۃ از ڈاکٹر یوسف القرضاوی۔ ص ۷۰۰-۷۰۱ [4] حاشیہ انسائیکلوپیڈیا آف اسلام (عربی ترجمہ) از ڈاکٹر محمد یوسف موسیٰ ص ۳۶۳ [5] موعظۃ المؤمنین من احیاء علوم الدین۔ از شیخ جمال الدین القاسمی ص ۹۰۔

زکاۃ کا ایک اہم مصرف (فی الرقاب) غلاموں کو آزاد کرنا بھی ہے، جوزف شاخت اس ضمن میں لکھتے ہیں:۔

"مالکیہ کے سوا تمام فقہاء غلام سے صرف مکاتب غلام مراد لیتے ہیں۔"

جوزف شاخت کی اس عبارت سے یہ تو پتہ چلتا ہے کہ مالکیہ کا مسلک جمہور کے خلاف ہے لیکن خود امام مالکؒ کے مسلک کی وضاحت نہیں ہوتی، امام شافعیؒ امام ابوحنیفہؒ حسن بصریؒ اور بعض دوسرے فقہاء کے نزدیک من الرقاب سے مراد مکاتب غلام ہیں، لیکن امام مالکؒ کہتے ہیں کہ اس سے مراد غلاموں کو خرید کر آزاد کرنا ہے، اور امام زہریؒ کے خیال میں اس سے دونوں ہی باتیں مراد ہیں۔

اسی طرح جوزف شاخت نے غارم (مقروض) کی تعریف یوں کی ہے۔

"غارم وہ شخص ہے، جو کسی دینی کام کے لیے قرض لے۔"

یہ تعریف مبہم اور ناقص ہے، غارم سے مراد ہر وہ شخص ہے جس پر قرض کا بار گراں ہو اور وہ اس کی ادائیگی کی سکت نہ رکھتا ہو، چنانچہ امام مالک، امام شافعی اور امام احمد رحمہم اللہ کا مسلک یہ ہے کہ مقروض ہر حال میں مستحق زکاۃ ہے، خواہ اس پر یہ قرض ذاتی ضرورت کی وجہ سے ہو، مثلاً نان نفقہ، شادی بیاہ یا علاج وغیرہ یا کسی دینی مصلحت کی بنا پر مثلاً دو برسر پیکار گروہوں میں صلح و مصالحت وغیرہ کی وجہ سے[1] شاخت کی مذکورۂ بالا عبارت میں دوسرے سبب کا تو ذکر ہے لیکن اس میں پہلے سبب کی طرف کوئی اشارہ نہیں ہے۔

زکاۃ کی دینی حیثیت | جوزف شاخت نے اگرچہ اپنے مقالے میں زکاۃ کے متعدد احکام بیان کئے ہیں پھر بھی وہ زکاۃ کی دینی حیثیت کو مشکوک قرار دیتے ہیں، وہ لکھتے ہیں کہ:۔

---

[1] فقہ الزکاۃ۔ از ڈاکٹر یوسف القرضاوی۔ ص ۶۲۲ تا ۶۳۲۔

"ان تمام تصریحات کے باوجود نبی کریمؐ کے عہد میں نظام زکوٰۃ انتہائی غیر واضح تھا اس کی کوئی دینی حیثیت نہ تھی، یہی وجہ ہے کہ نبی کریمؐ کے انتقال کے بعد جب عرب قبیلوں کی ایک بڑی تعداد نے اس کی ادائیگی سے انکار کر دیا تو مسلمانوں کی ایک کثیر جماعت نے جس میں حضرت عمرؓ بھی شامل تھے، اس پر نکیر نہیں کی۔ صرف حضرت ابوبکرؓ کے عزم و استقلال نے زکوٰۃ کو لازمی ادائیگی اور دینی فریضہ کی حیثیت بخشی، اسی کی بدولت بیت المال کا نظام قائم ہوا جو اسلام کی تبلیغ و ترویج میں بہت معاون و مددگار ثابت ہوا۔"

جوزف شاخت کا یہ دعویٰ، قرآنی آیات، مستند احادیث اور تاریخی حقائق کے یکسر خلاف ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک ہی سے زکواۃ کو اسلام میں مستقل ایک مذہبی فریضہ قرار دیا جا چکا تھا، اور آپؐ کی زندگی میں ہی اسکی وصولیابی اور تقسیم وغیرہ کا پورا انتظام عمل میں آچکا تھا، قرآن مجید میں متعدد مقامات پر اشارۃً اور صراحۃً اس کا ذکر ہے سورہ توبہ میں ہے۔

وَالْعَامِلِيْنَ عَلَيْهَا۔ (توبہ ۶۰)　اور زکواۃ ... ان لوگوں کے لیے بھی ہے جو صدقات کے کام پر مامور ہیں۔

اسی سورہ میں ایک دوسری جگہ ارشاد ہے۔

خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ۔ (۱۰۳)　اے نبیؐ، تم ان کے اموال میں سے صدقہ لیکر انھیں پاک کرو۔

خود رسول اللہؐ نے زکواۃ کے بارے میں یہ حکم دیا کہ:۔

توءخذ من اغنیائهم وترد فی فقرائهم[1]　(زکواۃ) ان کے مالداروں سے لی جائیگی اور ان کے محتاجوں کو دی جائے گی۔

---

[1] بخاری۔ کتاب الزکواۃ۔ باب وجوب الزکواۃ۔

احادیث و سیر کی کتابوں میں متعدد ایسے صحابۂ کرامؓ کے نام منقول ہیں، جو عہد نبویؐ میں صدقاتؐ کے وصول و تحصیل کے کام پر مامور تھے۔

اب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد مانعین زکواۃ سے مسلمانوں کی جنگ کا جہاں تک تعلق ہے، اس کے لیے کسی قدر تفصیل ناگزیر ہے۔ حافظ ابن کثیرؒ "البدایۃ والنہایۃ" میں لکھتے ہیں:

"جب حضورؐ کا انتقال ہوا تو بدوؤں کی ایک بڑی جماعت مرتد ہوگئی۔۔۔۔ بنو حنیفہ اور یمامہ کے کافی لوگ مسیلمہ کذاب سے جاملے اسی اثنا میں حضرت ابو بکرؓ الصدیق نے حضرت اسامہؓ کا لشکر رومیوں سے لڑنے کے لئے روانہ فرمایا جس کی وجہ سے ان کے پاس فوجی قوت بہت کم رہ گئی، چنانچہ بدوؤں کا حوصلہ اس قدر بڑھا کہ وہ مدینہ منورہ پر حملہ کرنے کے بارے میں سوچنے لگے۔۔۔۔ بدوؤں کے وفود مدینہ آنے لگے اور یہ لوگ نماز کا اقرار کرتے لیکن زکاۃ کی ادائیگی کا انکار کرتے"[۵۱]

حضرت ابوبکرؓ نے ان کی یہ بات تسلیم نہیں کی اور ان سے کوئی مصالحت بھی نہیں کی، چنانچہ ان لوگوں نے واپس جاکر یہ بات عام کردی کہ مدینہ منورہ میں بہت کم افراد رہ گئے ہیں، اس لیے انھوں نے اپنے اپنے قبیلوں کو مدینہ منورہ پر حملہ کرنے کے لیے امادہ کیا، اور کچھ ہی دنوں بعد حملہ بھی کردیا، چونکہ یہ حملہ حضرت ابوبکرؓ کے لیے غیر متوقع نہ تھا، اس لیے انھوں نے مدینہ منورہ میں بچے کھچے افراد کے ساتھ حملہ کا مقابلہ کیا، اور انھیں شکست دیکر فرار اختیار کرنے پر مجبور کیا۔ مانعینِ زکاۃ سے جنگ کا یہ پہلا معرکہ تھا۔

اسلامی تاریخ کا یہ بڑا نازک اور اہم وقت تھا، جب کہ خود اسلام کو خطرہ لاحق ہوگیا تھا، اور مدینہ منورہ بھی براہ راست زغہ میں آگیا تھا، ان حالات میں صحابۂ کرام کی

[۵۱] البدایۃ والنہایۃ۔ ج ۶، ص ۳۱۱۔

ایک جماعت نے حضرت ابوبکرؓ کو مشورہ دیا کہ

ان یترکھم وماھم علیہ
من منع الزکاۃ ویتألفھم
حتی یتمکن الایمان فی قلوبھم
ثم ھم بعد ذلک یزکون[۵۲]

ان لوگوں کو ان کے حال پر چھوڑ دیا جائے اور زکاۃ کی عدم ادائیگی کو نظر انداز کرکے ان کی تالیف قلب کی جائے تاکہ ان کے دلوں میں ایمان راسخ ہو جائے، اور یہ لوگ زکوۃ ادا کرنے لگیں۔

لیکن حضرت ابوبکرؓ نے ان کا مشورہ مسترد کردیا اور فرمایا کہ

ان الزکاۃ حق المال واللہ
لأقاتلن من فرق بین الصلوۃ
والزکاۃ[۵۳]

زکوۃ تو مال کا حق ہے، واللہ میں ہر اس شخص سے جنگ کروں گا جو نماز اور زکوۃ کے درمیان تفریق کرے گا۔

اس کے بعد تمام حضرات اس پر متفق ہوگئے کہ مانعین زکواۃ سے جنگ کی جائے[۵۴]۔ حضرت عمرؓ نے اگرچہ ابتداء میں حضرت ابوبکرؓ کی رائے سے کسی مصلحت کے پیش نظر اختلاف کیا تھا جس کو جوزف شاخت نے اپنے مفروضہ کی دلیل بنایا ہے، لیکن بعد میں وہ بھی حضرت ابوبکرؓ کی رائے سے متفق ہوگئے، اور فرمایا:

فواللہ ما ھو الا أن قد شرح
اللہ صدر ابی بکر للقتال
فعرفت انہ ھو الحق[۵۵]

بخدا، اللہ نے مانعین زکواۃ سے جنگ کے لیے حضرت ابوبکرؓ کا سینہ کھول دیا تھا، اور مجھے یقین ہوگیا کہ ان کا خیال ہی درست ہے۔

جوزف شاخت نے اس تاریخی واقعہ سے یہ نتیجہ نکالنے کی کوشش کی ہے، کہ زکاۃ کا نظام

[۵۲] البدایۃ والنہایۃ۔ ج ۶، ۳۱۱ [۵۳] ایضاً [۵۴] المغنی لابن قدامۃ۔ ج ۲، ص ۴۲۹-۴۲۸

[۵۵] بخاری، کتاب الزکوۃ، باب وجوب الزکاۃ۔

عہد نبوی میں مکمل اور واضح نہ تھا، نیز زکوٰۃ دین کے ضروری احکام میں شامل نہ تھی، شاخت کا یہ نظریہ تسلیم کرنے کے بعد تو یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ اگر کسی معاشرے میں جرائم اور بدعنوانیوں کے سدباب کے لیے انتظامیہ اور پولیس اقدامات کرے تو یہ اس بات کی دلیل ہے کہ اس سے قبل ان جرائم کی روک تھام کے لیے کوئی قانون اور انتظام نہ تھا۔

تہذیب، تمدن اور ثقافت کی طویل تاریخ میں نظام زکوٰۃ انتہائی اہمیت کا حامل رہا ہے۔ موجودہ ترقی یافتہ ملکوں کے معاشرتی حالات کے تحت مختلف نظام وجود میں آتے رہتے ہیں جو ملک کے معاشرتی حالات اور سیاسی اثرات اور معاشرے کو درپیش مختلف مسائل کا نتیجہ ہوتے ہیں، مگر اسلام میں زکوٰۃ کا نظام مکمل اسلامی زندگی کا ایک بنیادی جزء ہے، جس کے نفاذ کا حکم وحی الٰہی کے ذریعہ جاری کیا گیا۔

تجارتی سامان اور سونے چاندی پر زکوٰۃ کا حکم | جوزف شاخت لکھتے ہیں۔

"زکوٰۃ مسلمانوں پر واجب ہے، اور وہ شافعی مسلک کے مطابق صرف درج ذیل چیزوں پر وصول کی جاتی ہے (۱) زمین کی پیداوار یعنی غلہ (۲) پھل، خاص طور پر انگور، کھجور وغیرہ جن کا ذکر احادیث میں موجود ہے، (۳) جانوروں میں اونٹ، بکری اور گائے، (احناف کے نزدیک گھوڑے بھی شامل ہیں) (۴) سونا، چاندی اور سامان تجارت بشرطیکہ ایک سال تک بغیر استعمال کئے ہوئے محفوظ رہیں"۔

شاخت کا یہ کہنا کہ سونے چاندی اور سامان تجارت پر زکوٰۃ واجب ہے، صحیح ہے لیکن ان کا یہ کہنا کہ بشرطیکہ ایک سال تک بغیر استعمال کئے ہوئے محفوظ رہیں، صحیح نہیں ہے، ائمہ اربعہ میں سے کسی کے نزدیک بھی یہ قید نہیں ہے، ان سب کا اس پر اتفاق ہے کہ نقد مال مثلاً سونا اور چاندی اگر نصاب کے بقدر ہوں تو ان پر زکوٰۃ واجب ہو جاتی ہے، ان کے استعمال ہونے

یا نہ ہونے کی کوئی قید نہیں ہے، شوافع کے نزدیک بھی صرف شرط یہ ہے۔

ملک ما زاد علی النصاب		وہ ملکیت جو نصاب سے زائد ہو اور اس پر
طیلۃ الحول۔		ایک سال کا عرصہ گذر چکا ہو۔

البتہ تاجروں کو یہ دقت پیش آتی ہے کہ سال میں کئی مرتبہ نصاب سے زائد ان کی ملکیت کے اسباب اور نقود تبدیل ہوتے رہتے ہیں، اس صورت میں تمام فقہاء یہ کہتے ہیں کہ زکوٰۃ کی ادائیگی کے وقت ان کو چاہئے کہ اپنے سامان کی قیمت کا اندازہ لگا کر ان کو بھی اپنے نقد پیسوں میں شامل کر لیں اور پھر اس مجموعی رقم سے ڈھائی فیصد کے حساب سے اپنی زکوٰۃ ادا کر دیں۔

شاخت نے اس سلسلہ میں یہ اہم حکم بھی نظرانداز کر دیا ہے کہ تجارتی سامان میں اصل مالیت کے علاوہ منافع پر بھی زکوٰۃ واجب ہوتی ہے۔

زکوٰۃ کی فرضیت کا زمانہ | زکوٰۃ کے بارے میں جوزف شاخت کا یہ نظریہ واضح ہو چکا ہے کہ وہ اس نظام کو خدائی نظام کے بجائے معاشرے کی ترقی اور اس کی ضرورت کا ایک نتیجہ سمجھتے ہیں، اپنے اس خود ساختہ نظریہ کو ثابت کرنے کے لئے وہ حقائق کو غلط طریقہ سے پیش کرنے سے بھی دریغ نہیں کرتے، زکوٰۃ کی فرضیت کی تعیین میں علماء کا اختلاف ہے، اس اختلاف کا ذکر شاخت نمایاں طور پر کرتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں۔

"علمائے اسلام کے درمیان زکوٰۃ کی فرضیت کی تحدید میں کافی اختلاف ہے۔ اس کی فرضیت ۲ھ سے ۹ھ تک بتائی جاتی ہے، اسی طرح علماء کا یہ بھی خیال ہے کہ زکوٰۃ کی فرضیت کے بعد انفاق کے عمومی احکام (مثلاً صدقات و خیرات) منسوخ ہو گئے"۔

شاخت کے یہ خیالات ازروئے تحقیق درست نہیں ہیں، زکوٰۃ کی فرضیت کے وقت کے بارے میں

جو مستند اقوال ملتے ہیں۔ ان سے ثابت ہوتا ہے کہ ۲ھ اور ۵ھ کے درمیان فرض ہوئی تھی۔ ...... باقی ۹ھ کا قول درج ذیل اسباب کی بنا پر صحیح نہیں ہے۔

۱۔ اسکی روایت ضعیف ہے، اس لیے اس کو دلیل نہیں بنایا جاسکتا۔

۲۔ زکاۃ کے فرض ہونے کے سلسلہ میں مستند اقوال یہی ہیں کہ وہ ۵ھ سے پہلے فرض ہو چکی تھی، البتہ اسکی وصولیابی کے لیے عاملوں کا تقرر ۹ھ میں ہوا، اس کی وجہ یہ ہو سکتا ہے، دونوں باتوں میں التباس ہو گیا ہو۔[1]

اسی طرح زکوٰۃ کی فرضیت کے بعد مالی عبادت کے دوسرے احکام یعنی صدقات و خیرات کے منسوخ ہونے کا دعویٰ بھی صحیح نہیں۔ کیونکہ زکوٰۃ کا حکم فرض ہونے کے بعد بھی ان احکام کا وجوب باقی رہا۔

زکاۃ اور بیت المال | جوزف شاخت کا یہ خیال ہے کہ زکاۃ بیت المال میں جمع کی جاتی تھی اور خلیفۂ وقت اس کو جہاں مناسب سمجھتا خرچ کرتا تھا، وہ لکھتے ہیں:۔

"نبی کریمؐ نے مدینہ منورہ میں زکاۃ کی وصولی اور تقسیم کا باقاعدہ نظم بنایا۔ جس کا ذکر سورۂ توبہ کی آیت ۶۰ میں موجود ہے۔ لیکن نبی کریمؐ نے زکاۃ کا مال صرف محتاجوں، غریبوں اور مسکینوں ہی پر خرچ نہیں کیا بلکہ حالات کے پیش نظر جنگ کے موقع پر اور سیاسی حالات کے تحت بھی اس کو استعمال کیا، یہی وجہ تھی کہ آپؐ نے یہ حکم بھی جاری کر دیا کہ زکاۃ حکومت کے خزانے میں ہی جمع کی جائے گی۔"

جوزف شاخت کے مذکورہ بالا جملوں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ زکاۃ کا مصرف خلیفۂ وقت اور حکومت کے ہاتھ میں ہوتا تھا۔ مگر یہ بات درست نہیں ہے، زکاۃ کے مصارف اور اس کے

---

[1] فتح الباری لابن حجر ج ۳ ص ۲۶۶۔

کمں نظام کا ذکر قرآن مجید میں بیان کیا گیا ہے، سنت نبویؐ نے ہمیشہ زکاۃ کے مصارف اور بیت المال کے مصارف میں تفریق کی ہے، زکاۃ صرف متعین اموال سے وصول کی جاتی رہی ہے، اور قرآن کریم نے جو موقع بیان کیے ہیں انہی میں اس کو صرف کیا گیا، سنت نبویؐ اور خلفائے راشدینؓ کا طرز عمل اسکی روشن دلیل ہے، اس سے فقہ کا عام طالب علم بھی واقف ہے، اسی اہمیت اور نزاکت کے پیش نظر بعض مستشرقین نے بھی اس کو واضح کیا ہے۔ کولسن نے انسائیکلوپیڈیا آف اسلام میں لفظ "بیت المال" کے ذکر میں اس کی صراحت کی ہے، کہ خلیفہ کو زکاۃ جمع کر کے متعینہ مصارف میں خرچ کرنے کا حق حاصل ہوتا ہے۔ جب کہ بیت المال کی دوسری مدوں کو وہ مسلمانوں کے خیر و بہبود کے مطابق کہیں بھی خرچ کرنے کا مجاز ہے۔

شاخت کی عبارت سے زکوٰۃ اور بیت المال کے فرق کی وضاحت نہیں ہوتی ہے، ہاں مصارف زکوٰۃ اور مصارف بیت المال میں التباس ضرور پیدا ہو جاتا ہے۔

نصاب زکوٰۃ | زکاۃ کے نصاب کے سلسلہ میں جوزف شاخت لکھتے ہیں۔

"زکاۃ میں نصاب کی پابندی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد شروع ہوئی، قرآن مجید اور سنت نبوی میں اس کا کوئی ذکر نہیں ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم زکاۃ کی اتنی ہی مقدار طلب فرماتے تھے جس کی ضرورت ہوتی تھی، چنانچہ قرآن مجید نے زکاۃ کی کوئی مقدار متعین نہیں کی بلکہ کہا:۔

وَيَسْأَلُونَكَ مَاذَا يُنْفِقُونَ ، — پوچھتے ہیں: ہم راہ خدا میں کیا خرچ کریں، کہو۔
قُلِ الْعَفْوَ ، (بقرہ ۲۱۹) — جو کچھ تمہاری ضرورت سے زائد ہو۔

سنت نبویؐ میں زکوٰۃ کے بارے میں جو اقوال ملتے ہیں، ان سے بھی نصاب زکوٰۃ کی تحدید نہیں ہوتی حضرت ابوذرؓ کی طرف یہ قول منسوب کیا جاتا ہے کہ کسی شخص کو اپنی ضرورت سے زائد مال و دولت

جمع کرنے کی اجازت نہیں ہے۔ اس قسم کے اقوال بعض اور لوگوں سے بھی نقل کیے گئے ہیں۔

جوزف شاخت نے عام حدیثوں اور ائمہ کے اقوال سے یہ استدلال بھی کیا ہے کہ زکوٰۃ کا کوئی متعین نصاب قرآن و سنت میں نہیں بیان کیا گیا ہے، حالانکہ نظام زکوٰۃ کے متعلق روایتوں سے اس کی نفی ہوتی ہے، مذکورہ بالا روایتیں نفلی صدقات سے متعلق ہیں، ان سے زکوٰۃ اور نصاب زکوٰۃ مراد لینا درست نہیں۔[1]

صدقہ فطر شاخت نے صدقہ فطر کے بارے میں، درج ذیل فقرہ پر اپنے مقالہ کو ختم کیا ہے کہ:۔

"زکاۃ فطر کے بارے میں آخری اور مشہور رائے یہ ہے کہ یہ واجب ہے، سوائے مالکیہ کے جو اس کے مسنون ہونے کے قائل ہیں"۔

یہ غلط ہے، کیونکہ تمام ائمہ زکوٰۃ فطر کے وجوب کے قائل ہیں، اور یہ بھی صحیح نہیں ہے کہ مختلف آراء میں آخری اور مشہور رائے اس کے وجوب کی ہے، کیونکہ عہد نبوی ﷺ سے ہی اس کا واجب ہونا مشہور و معروف ہے۔

ماخذ جوزف شاخت کا یہ مقالہ انسائیکلوپیڈیا آف اسلام جیسی اہم دستاویز میں شائع ہوا ہے لیکن افسوس ہے کہ اہم مصادر و مراجع سے خالی ہے، اس کے اخیر میں صرف دس مراجع کا ذکر ہے، اور یہ سب مستشرقین ہی کی کتابیں ہیں، کسی عرب یا مسلمان محقق کی کتاب کا کوئی حوالہ نہیں ہے، البتہ دوسرے ایڈیشن ۱۹۶۱ء میں صبح الاعشیٰ (قلقشندی) کا اضافہ ہے، مگر یہ فقہ و حدیث کے بجائے ادبی و تاریخی واقعات کا مجموعہ ہے، ان وجوہ سے ان کے مقالہ کا علمی پایہ فروتر ہے۔ اور اپنے موضوع پر ناقص ہونے کے علاوہ غلطیوں سے پُر ہے، اس کو زکوٰۃ کے لئے ماخذ نہیں بنایا جاسکتا۔

---

[1] فقہ الزکاۃ۔ از ڈاکٹر یوسف القرضاوی۔ جلد ۲۔ ص ۹۹۱

یادِ رفتگان

از سید صباح الدین عبدالرحمٰن

(۳)

مولانا محمد علی اور ڈاکٹر مختار احمد انصاری (المتوفی ۱۹۳۶ء) اپنے سیاسی مسلک میں ایک دوسرے سے بہت ہی مختلف تھے، مگر سید صاحبؒ اپنی شرافت طبع کی وجہ سے ان سے بھی بہت قریب رہے، ان کی اچانک موت کی خبر ان کو ملی، تو لکھتے ہیں کہ "دل دھڑکا، آنکھیں پُرنم ہوئیں، اور سینے سے آہ کا ایک شعلہ اٹھا جس نے صبر و سکون کی متاع کو جلا کر خاکستر کر دیا۔ وہ ان کے اس لیے قدرداں تھے، کہ ان کی نظر میں فیاضی کے مجسمہ، لطف و محبت کے پیکر اور حسن اخلاق کے فرشتے تھے، متانت اور سنجیدگی ان کی طبیعت اور غور و فکر ان کی عادت تھی، وہ وطن کے خدمت گذار، انسانیت کے پیغام بر اور ملک میں ہندو مسلم اتحاد کے منبع تھے" (یادرفتگان صفحہ ۱۷۷)

اور جب اپریل ۱۹۳۸ء میں علامہ محمد اقبال کی وفات ہوئی، تو سید صاحبؒ ان کی دائمی جدائی پر مرغ بسمل کی طرح بے قرار ہوئے، ویسے ہی تڑپے جیسے مولانا محمد علی کی موت پر تڑپے تھے، ان پر کوئی علمی تعزیتی تحریر نہیں لکھی لیکن جو مختصر تحریر ہے، وہ ایجاز کا اعلیٰ نمونہ ہے، اس کے سامنے سارے اطنابات ہیچ ہیں، ان سے سید صاحبؒ کی ملاقاتیں برابر ہوتی رہیں، کابل کے وفد میں تو ان کا ساتھ کافی دنوں تک رہا، اس لیے ان کو بہت قریب سے جاننا اور پہچاننا، اور اسی سفر میں ان کو احساس ہوا، کہ کاروان ملت کا ایسا حدی خوان صدیوں کے بعد پیدا ہوا ہے، اور شاید صدیوں کے بعد پیدا ہو، خود علامہ محمد اقبال ان کو استاذ الکل اور جوئے شیر اسلامیہ کا فرہاد سمجھتے رہے، اس طرح دونوں

ایک دوسرے کے قدرداں تھے، اگر علامہ اقبال کی زندگی میں سید صاحبؒ کا انتقال ہوگیا ہوتا، تو معلوم نہیں وہ ان کی موت پر اپنے کیا کیا خیالات منظوم فرماتے، مگر ان کی وفات سید صاحبؒ کی زندگی میں ہوئی تو مولانا محمد علی مرحوم کی رحلت پر ان پر جو غم ناک کیفیت طاری ہوئی، وہی علامہ اقبال کی مفارقت پر ہوئی، اور ایک بار پھر ان کا سینۂ سوزِ نہاں، غمِ پنہاں اور درد کا ایک آتشکدہ ان بن گیا، اور اس سے جو چنگاریاں بلند ہوئیں، وہ ایک بار پھر پرسوز، الم ناک اور غم ناک تحریروں کا ایک بے مثال نمونہ بن گئی ہیں، اس کی ابتدا وہ اس طرح کرتے ہیں،

"وَقَعَتِ الْوَاقِعَۃ۔ آخر موت اور حیات کی چند ہفتوں کی کش مکش کے بعد ڈاکٹر اقبال نے دنیا کو الوداع کہا، صفر کی انیسویں اور اپریل کی اکیسویں صبح کو عمر کی اکسٹھویں بہار دیکھ کر اور شاعری کی دنیا میں چالیس برس چہچہا کر یہ بلبل ہزار داستان اب ہمیشہ کیلئے خاموش ہوگیا۔"

موت کے ایک سادہ واقعہ کا اظہار مذکورۂ بالا پیرایہ میں جس طرح ہوا ہے، وہ عام طرزِ تحریر سے بالکل الگ ہے، اس سے اندازہ ہوگا کہ سید صاحبؒ کی تحریروں میں ان کا اپنا خاص انداز ہوتا تھا اسی کے بعد جب وہ یہ لکھتے ہیں، کہ

"وہ ہندوستان کی آبرو، مشرق کی عزت، اور اسلام کا فخر تھا، آج دنیا ان ساری عزتوں سے محروم ہوگئی۔"

تو یہ صدائے ربانی اور آوازِ سروش کے مانند کانوں میں گونجتی سنائی دیتی ہے، اور پھر اس دعویٰ کو اس دلیل سے مستحکم کرتے ہیں کہ

"ایسا عارف فلسفی، عاشقِ رسول، فلسفۂ اسلام کا ترجمان اور کاروانِ ملت کا حدی خواں صدیوں کے بعد پیدا ہو

یہ لکھنا کوئی معمولی بات نہیں، کیونکہ اس کا لکھنے والا ایک ماہرِ قرآنیات، ایک عارف، محدث، مورخ

اور سیرۃ النبیؐ کا بے مثال مصنف ہے، اس سے اختلاف کرنے کی گنجائش نہیں،

اور پھر جن ارباب ذوق کے سامنے علامہ محمد اقبال کے کلام کے سارے مجموعے ہوں، ان پر ذیل کی تحریروں کے پڑھتے وقت مصنف کے انبساط اور لذت کا نشاط طاری ہوجائے گا۔

"اس کے ذہن کا ہر ترانہ بانگِ درا، اس کی جانِ حزیں کی ہر آواز زبورِ عجم، اسکے دل کی ہر فریاد پیامِ مشرق، اسکے شعر کا ہر پرپرواز بالِ جبرئیل تھا، اس کی فانی عمر گو ختم ہوگئی لیکن اسکی زندگی کا ہر کارنامہ جاوید نامہ بن کر انشاء اللہ باقی رہے گا۔"

یہ کیسی پر اثر سطریں ہیں، جن کے لکھنے کے بعد لکھنے والے پر خود غیر معمولی اثر پیدا ہوگیا ہوگا۔ اور جس کے لیے یہ لکھی گئی ہیں، اس کے لیے یہ دعائیں خود بخود قلم سے نکل پڑی ہیں۔

"امید ہے کہ ملت کا یہ غم خوار شاعر اب عرشِ الٰہی کے سایہ میں ہوگا، اور قبول مغفرت کے پھول اس پر برسائے جارہے ہوں گے خداوندا! اس کے دل شکستہ کی جو ملت کے غم سے رنجور تھا غم خواری فرما، اور اپنی ربانی نوازشوں سے اس کے قلبِ حزیں کو مسرور کر۔"

یہ دعائیں خطباتِ مدراس، رحمتِ عالم اور سیرۃ النبیؐ کے مصنف یا چاندنی کی چاندنی کے ایسا شفاف دل رکھنے والے عالمِ دین کے قلم سے نکلی ہیں، جو ضرور مقبول اور محمود ہونگی، پھر وہ ان کے کارناموں پر اپنی پوری دینی بصیرت سے یہ باوقار اور جاندار تبصرہ کرتے ہیں۔

"مرحوم کی زندگی کا ہر لمحہ، زندگی کے لیے ایک نیا پیام لایا تھا، وہ توحیدِ خالص کا پرستار، دینِ کامل کا علم بردار تجدیدِ ملت کا طلب گار اس کے رونگٹے رونگٹے میں رسول انام علیہ السلام کا عشق پیوست تھا، اور اس کی آنکھیں جسمِ اسلام کے ہر ناسور پر اشکبار رہتی تھیں، اس نے مستقبلِ اسلام کا ایک خواب دیکھا تھا، اسی خواب کی تعبیر میں اس کی ساری عمر ختم ہوگئی۔"

آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آسکتا نہیں

ایک پیراگراف میں علامہ اقبال کے سارے کارناموں کو سمیٹ کر رکھ دیا گیا ہے، اور پھر وہ مولانا محمد علی اور علامہ اقبال دونوں کے فدائی اور شیدائی تھے، اس لیے اپنی اس تعزیتی تحریر میں مولانا محمد علی کا بھی ذکر لے آئے ہیں، اور اس موثر اسلوب اور پُر کیف محبت اور گہری نظر وفکر کے ساتھ دونوں کو ایک ساتھ لاکھڑا کر دیا ہے، اس کو پڑھ کر ذہن کے دریچے کھل جائیں گے، لکھتے ہیں:۔

"کہنے کو تو ہم میں ملت کے غم خواروں کی کمی نہیں، اور نہ امت کے دستداروں کی قلت ہے، مگر واقعہ یہ ہے کہ نئی تعلیم نے اپنے ساٹھ ستر برس کے طویل حصہ میں دو ہی سچے مسلمان غم خوار پیدا کیے، ایک محمد علی مرحوم، اور دوسرے اقبال مرحوم، دونوں مرحومین پر خدا کی بڑی رحمت ہو، ان کے دلوں میں اسلام کا حقیقی سوز تھا، اور رسول رحمت (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ساتھ سچا عشق، نئے زمانہ کی جھوٹی آب وتاب اور نئے تمدن کی بڑی چمک دمک سے ان کی آنکھیں خیرہ نہ تھیں، آفتاب اسلام کی ضیا ریزی کے مقابلہ میں ان کے سامنے جدید تہذیب وتمدن اور زمانہ حال کی تجدیدات کی نئی روشنی موخشب کے مصنوعی نور سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی تھی، خدا ان دونوں کی قبروں کو اپنے نور سے بھر دے۔

علامہ اقبال کا بڑا کارنامہ یہ بھی ہے کہ انھوں نے مسلمان نوجوانوں کو متاثر کر کے ان میں نئی روح پھونک دی، سید صاحب کو بھی اس کا اعتراف ہے، اور اس کو اپنے مخصوص انداز بیان کے ساتھ اس طرح پیش کیا ہے:

"اقبال کی قومی شاعری بیسویں صدی کے آغاز کے ساتھ شروع ہوئی، بیسویں صدی کے

اس پیغام رسان نے اپنے اڑتیس (۳۸) برس کے شاعرانہ پیغاموں سے ملت کے نوجوانوں میں نئی امنگ بھر دی، اور نئے سفر کے قطع منزل کے لیے ان میں نئے سرے سے ہمت پیدا کر دی، اقبال کا یہ دعویٰ حرف حرف سچا تھا،

اقبال کا ترانہ بانگِ درا ہے گویا
ہوتا ہے جادہ پیما پھر کارواں ہمارا

اور پھر علامہ اقبال پر ان کی موت کے بعد جو کام ہوگا، اس کی بھی پیش گوئی اپنی اس تعزیتی تحریر میں کی، اور اس کے بعد علامہ محمد اقبال کو جو مقام حاصل ہوگا، اس کی نشاندہی اپنی دور بین نگاہوں سے کی، لکھتے ہیں:۔

"اقبال کی تصنیفات زمانہ میں یادرہیں گی، وہ اسلام کا غیر فانی لٹریچر بن کر انشاء اللہ رہے گا، ان کی شرحیں لکھی جائیں گی، نظریے ان سے بنیں گے، ان کا فلسفہ تیار ہوگا۔ اس کی دلیلیں ڈھونڈی جائیں گی، قرآن پاک کی آیتوں، احادیث شریفہ کے جملوں، مولانا روم اور حکیم سنائی کے تاثرات سے ان کا مقابلہ ہوگا، اور اس طرح اقبال کا پیام اب دنیا میں انشاء اللہ زندہ رہے گا، اور اقبال زندہ جاوید۔"

یہ تحریر ۴۹ سال پہلے لکھی گئی تھی، اس وقت سے اب تک علامہ محمد اقبال پر جو کچھ کام ہوا ہے، یا ہو رہا ہے، اس پیشین گوئی کے مطابق ہے اور علامہ اقبال کو زندہ جاوید ہونے میں کیا شک ہے۔

بعض نقادوں نے لکھنا شروع کیا تھا کہ علامہ محمد اقبال کا فلسفہ یورپ کے فلسفیوں مثلاً نطشے ہیگل، کانٹ سے مستعار ہے، سید صاحب اس سے اتفاق نہیں کرتے، اس لیے انھوں نے اعتماد کی کمی بلکہ اپنے احساس برتری اور اپنے اسلوب کی توانائی، اور تحریر کی دلآویزی کے ساتھ یہ لکھ کر تردید فرمائی

"اقبال صرف شاعر نہ تھا، وہ حکیم تھا، وہ حکیم نہیں جو ارسطو کی گاڑی کے قلی ہوں اور یورپ کے فلاسفوں کے خوشہ چیں، بلکہ وہ حکیم جو اسرار قدرت کا محرم اور رموز فطرت کا آشنا تھا، وہ نئے فلسفہ کے ہر راز سے آشنا ہو کر اسلام کے راز کو اپنے رنگ میں کھول کر دکھاتا تھا، یعنی بادۂ انگور کو نچوڑ کر کوثر و تسنیم کا مسطلہ تیار کرتا تھا۔"

ان چند سطروں کو سامنے رکھ کر علامہ محمد اقبال کے افکار و خیالات کا پورا تجزیہ کیا جا سکتا ہے، جس کے بعد ان کی صحیح اور اصلی تصویر سامنے آئے گی، اور اسی روشنی میں وہ اب سمجھے اور سمجھائے جا رہے ہیں۔

سید صاحبؒ نے اس کے بعد کابل کے وفد کا ذکر کیا ہے، جس میں وہ ان کے ساتھ رہے، پھر یہ لکھا ہے، کہ مولانا شبلیؒ نے ان کو اسی وقت پہچان لیا تھا جب ان کی شاعری کے مرغِ شہرت کے پر و بال نہیں پیدا ہوئے تھے، اور انھوں نے پیشین گوئی کی تھی کہ حالی و آزاد کی جو کرسیاں خالی ہوں گی، ان میں سے ایک اقبال کی نشست سے پُر ہو جائے گی، سید صاحبؒ یہ لکھ کر رقم طراز ہیں، کہ افسوس کہ آج اڑتیس برس کے بعد وہ کرسی خالی ہو گئی، اور اس کے پُر ہونے کی کوئی صورت نہیں، اس کے بعد وہ انتہائی درد قلق، رنج اور الم کے ساتھ اپنی ماتمی تحریر یہ لکھ کر ختم کر دیتے ہیں۔

"اقبال ہندوستان کا فخر، اقبال اسلامی دنیا کا ہیرو، اقبال فضل و کمال کا پیکر، اقبال حکمت و معرفت کا دانا، اقبال، کاروان ملت کا رہنما اقبال، رخصت، رخصت، الوداع، الوداع

سلام اللہ علیک و رحمۃ اللہ الی یوم التلاق۔"

کیسی پُر درد تحریر ہے، جو دل سے نکلی ہے، اور پڑھنے والے کے دل سے جا کر ٹکراتی ہے، یہ ماتم بہت طویل نہیں، بلکہ یہ دنیا کی کسی بھی بہترین ماتمی تحریر کے ساتھ رکھی جا سکتی ہے، اور آئندہ اسکے ایجاز کا اطناب اور اسی کے اجمال کی توضیح اور اسی کے اختصار کی تفصیل ہوتی رہے گی،

ہندوستان کے سیاسی لیڈروں میں حیدرآباد کے نواب بہادر یار جنگؒ سے بھی سید صاحبؒ کے قریبی تعلقات تھے، مشہور تھا کہ وہ مہدوی ہیں،

ان کا سیاسی پلیٹ فارم حیدرآباد کا اتحاد المسلمین تھا، پھر آل انڈیا مسلم لیگ ہو گیا، مگر ان کے سیاسی خیالات سے قطع نظر کر کے اُن سے بارہ تیرہ برس تک بڑی محبت سے ملتے رہے، اور اپنے دل میں محبوب اس لیے بنائے رکھا، کہ وہ بات کے دھنی مخلص، وفادار خدا ترس، عاشق رسول، مجاہد اسلام، بہادر مسلمان، سپاہی اور ہر معنی میں سپاہی، اور بہادر سپاہی اور بہادر مسلمان تھے، ان کی وفات کی خبر ان کو ملی تو لکھتے ہیں کہ "ان کا ہشاش بشاش متبسم چہرہ، ان کا صحیح اور تنومند جسم، ان کا خوبصورت اور دلفریب قد بالا ہر چیز بجلی کی کوند کی طرح سامنے آئی اور ان کی موت کی خبر کو جھٹلا کر چلی گئی، روایت نے صدق کی، صدق نے یقین کی، اور یقین نے آنسوؤں کی صورت اختیار کی، اور انا للہ کے ساتھ دل کی گہرائی سے ان کی مغفرت کے لیے دعا مانگی۔"

قائد اعظم محمد علی جناح کو جلسوں میں تو سید صاحبؒ دیکھتے رہے، مگر ان سے راہ و رسم نہیں پیدا ہوئی، مگر وہ ان کو ہندوستان کا ایک بڑا سیاسی دماغ برابر سمجھتے رہے، ۱۹۱۶ء میں انھوں نے مسلم لیگ کے صدر کی حیثیت سے لکھنؤ میں دیکھا، اور اس حیثیت سے ہندو مسلم اتحاد کے لیے لکھنؤ پیکٹ بنوایا، جو اون کا بڑا عظیم کارنامہ تھا، اس سے متاثر ہو کر ان پر ایک نظم کہی جسکا آخری شعر یہ تھا۔

ڈاکٹر اس کا اگر مسٹر محمد علی جینا رہا
پر مریض قوم کے جینے کی ہے کچھ امید

یہ پیشین گوئی ایک لحاظ سے صحیح ثابت ہوئی، قائد اعظم محمد علی جناح کی وفات پر جو مضمون لکھا اس میں ان کی سیاسی سرگرمیوں پر سیر حاصل تبصرہ اس طرح تھا۔

"مرحوم کے سیاسی کارنامے آفتاب کی طرح روشن ہیں، وہ بڑے قانون داں، بڑے مناظر، اور اجتماعیات کے بڑے ہی نبض شناس تھے، اپنے پیروؤں پر بلا کا اثر رکھتے تھے"

ان کی بڑی خصوصیت اپنی بات بہ جبر کر دوسروں سے منوانے کی قوت تھی، انھوں نے اپنی اس قوت کا مظاہرہ پاکستان کے مطالبہ میں پوری طرح کیا، اور بالآخر کامیابی حاصل کی۔

ان چند سطروں میں قائد اعظم کی جو تصویر کھینچ دی ہے، اسی کی روشنی میں ان کی سوانح عمری مرتب ہوتی رہے گی۔

مولانا فضل الحسن حسرت موہانی (المتوفی ۱۹۵۱ء) کی وفات پر جو تحریر لکھی ہے، اس میں انھوں نے ان کی طبیعت کی، دوستوں کی پاسداری، زندگی کی سخت کوشی، صوفیانہ مشرب سے وابستگی، سیاست میں حق گوئی، اپنی بات منوانے میں بے باکی، کرداری پختگی، سیاسی عقیدہ کی استواری، قید و بند کی صبر آزمائی کے ساتھ ان کی سخنوری میں طرح طرح کے رنگوں میں ان کی جلوہ گری کی ایسی مرقع آرائی کی ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کی نظروں میں حسرت بھی ان کے ہیرو تھے، آخر میں لکھتے ہیں کہ "ان میں حضرت ابوذر غفاری صحابیؓ کی شان نظر آتی تھی، جن کی نسبت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا "ابوذر سے زیادہ کسی حق گو پر آفتاب کی کرن کبھی نہیں چمکی" سچ تو یہ ہے، کہ اس عہد پر فریب میں حسرت سے زیادہ کسی حق گو پر آفتاب کی کرن کبھی نہیں چمکی، حضرت ابوذرؓ کی طرح یہ قول نبویؐ حسرتؔ پر بھی صادق آتا ہے، حضرت ابوذرؓ کی حق گوئی نے ان کی زندگی میں ان کو تنہا چھوڑ دیا، ان کا کوئی ساتھی نہیں رہا، اس کا مورد بھی حسرت کی زندگی تھی، تنہا جیا، اور ستودہ مرا، سید صاحبؒ نے اپنی اس تعزیتی تحریر میں حسرت کے دور کی سیاست کے پیچ و خم کو بھی بڑے عمدہ طریقہ سے پیش کیا ہے۔

ہندوؤں کے مشاہیر پر ماتم | سید صاحبؒ اپنے ہم وطن ہندوؤں کے مشاہیر پر بھی بڑی فراخ دلی رواداری بلکہ وطن دوستی کے ساتھ ماتم کرتے رہے، سر آشوتوش مکرجی (المتوفی ۱۹۲۴ء) کو یہ لکھ کر خراج عقیدت پیش کیا، کہ وہ ایک نامور بیرسٹر، ایک قابل جج، ایک بڑے مصنف اور مشہور ریاضی داں اور

بڑے مقبول وایس چانسلر تھے، انھوں نے کلکتہ یونیورسٹی کو برطانوی حکومت کی بیجا قید سے آزاد رکھا،

سید صاحبؒ مشہور افسانہ نگار پریم چند (المتوفی ۱۹۳۶ء) کی وقعت اپنے دل میں اس لیے رکھتے کہ ان کی اردو عبارت تکلف اور بناوٹ سے پاک اور درجہ سادہ ہوتی، ان کی کہانیوں کا اثر زبان میں نہ تھا، بلکہ ان کے بیان میں تھا، انھوں نے پچیس برس تک اپنے دیہاتیوں کی کہانی اپنے شہری بھائیوں کو سنائی۔ (یادرفتگان ص ۱۷۴)

ریاست حیدرآباد کے صدر اعظم مہاراجہ سر کشن پرشاد (المتوفی ۱۹۴۰ء) سے سید صاحبؒ برابر ملتے رہے، ان کی نظر میں ان کی قدر اس لیے تھی کہ وہ عربی، فارسی اور انگریزی زبانوں کے ماہر تھے، علمی مذاق ستھرا تھا، شعر و سخن میں بھی مہارت رکھتے تھے، وحدت الوجود کو ہندو مسلم اتحاد کا ذریعہ سمجھتے تھے، ان کی ایک نعت کو یہ شرف حاصل ہوا، کہ مدینہ منورہ کی مسجد نبویؐ کے نیچے کتب خانہ کی ایک دیوار پر آویزاں کی گئی۔ (ایضاً ص ۲۰۷)

سید صاحب دیانرائن نگم اڈیٹر زمانہ (المتوفی ۱۹۴۲ء) کے بھی قدرداں اس لیے ہوئے کہ ان کی وجہ سے رسالہ زمانہ ہندو مسلم اہل علم و قلم کا سنگم تھا۔ (ایضاً ص ۲۴۴)

مستشرقین کی موت پر تاسف | پروفیسر آرنلڈ (المتوفی ۱۹۳۰ء) ایم۔ اے۔ او کالج میں مولانا شبلیؒ کے ساتھ تھے، دونوں میں بڑے گہرے تعلقات رہے، علی گڑھ ہی کے قیام کے زمانہ میں اپنی مشہور تصنیف پریچنگ آف اسلام لکھی، جس کا اردو ترجمہ عنایت اللہ صاحب مشہور مترجم نے دعوت اسلام کے نام سے کیا، گورنمنٹ کالج لاہور چلے گئے، جہاں علامہ محمد اقبال ان کے شاگرد ہوئے، اور جب وہ وہاں سے چلے گئے، تو علامہ محمد اقبال نے "نالۂ فراق" کے عنوان سے ان پر ایک نظم لکھی، لندن میں انھوں نے انڈیا آفس لائبریری اور اسکول آف اورنٹیل اسٹڈیز میں بھی کام کیا، سید صاحبؒ وفد خلافت میں لندن گئے، تو ان سے برابر ملاقاتیں کرتے رہے، ان کی وفات پر سید صاحبؒ اپنی تعزیتی تحریر میں ان کی

خوبیوں کا ذکر لطف ولذت سے کیا ہے، (ایضاً ص ۱۰۵-۱۰۳)

سید صاحبؒ جرمنی کی ہائے یونیورسٹی کے علوم مشرقیہ کے پروفیسر ہادر (المتوفی ۱۹۳۶ء) کی قابلیت کے بڑے معترف تھے، اس لیے کہ ان کو یورپ کی تمام زبانوں کیساتھ ایشیا کی متعدد زبانوں پر بھی مہارت تھی، اسی پر مختلف کتبوں کے پڑھنے کے ماہر تھے، امام غزالی کی احیاء العلوم کے متفرق ابواب کے ترجمے کیے، اسلامی علم مرایا د مناظر پر بھی مضامین لکھے، (ایضاً ص ۱۶۵)

سید صاحبؒ آکسفورڈ کے پروفیسر مارگولیوتھ کو بہت ناپسند کرتے، مگر لندن میں ان سے ملاقاتیں کیں، جب ۱۹۴۰ء میں ان کی وفات ہوئی، تو لکھا، کہ وہ نسلاً یہودی تھے، پھر عیسائی ہوگئے، اس لیے اسلام اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم سے ان کی عداوت اکبری نہیں بلکہ دوہری رہی۔ (ایضاً ص ۲۰۳)

اسلامی ممالک کے فضلاء پر نظر | ان کی نظر اسلامی ممالک کے مشہور ارباب کمال پر رہی، ان میں سب سے زیادہ سید رشید رضا مصری سے متاثر تھے، مولانا شبلیؒ کی دعوت پر ندوہ بھی آئے، جہاں ان کا شاندار استقبال کیا گیا، سید صاحبؒ ان سے لکھنؤ کے علاوہ مصر اور حجاز کے موتمر اسلامی میں برابر ملتے رہے، وہ ان کے رسالہ المنار کے بڑے گرویدہ رہے، پھر فقہ، تفسیر اور حدیث میں ان کو جو ید طولیٰ تھا، اس سے اتنے متاثر تھے، کہ جب ان کی وفات ۱۹۳۵ء میں ہوئی تو لکھا کہ وہ دنیائے اسلام کے کاشانہ میں ہدایت کے چراغ تھے، افسوس اس کا ہے، کہ اس چراغ کے گل ہونے سے المنار کی وہ روشنی بھی بجھ جائے گی، جس کی کرنیں ہر ماہ تمام دنیا میں پھیلتی تھیں۔ (ایضاً ص ۱۴۴-۱۴۳)

ٹرکی کے مصطفےٰ کمال کی شخصیت آخر میں متنازع فیہ ہوگئی تھی، مگر سید صاحبؒ انکی قدر اس لیے کرتے رہے کہ انھوں نے بیمار ٹرکی کو شفا اور اس کو موت کے پنجہ سے چھڑا کر زندگی بخشی، اسی لیے جب ان کی وفات ۱۹۳۸ء میں ہوئی تو اپنی تعزیتی تحریر میں ان کے لیے دعا کی، کہ اللہ تعالےٰ مرحوم کو اپنی مغفرت و رحمت کے فتوحات سے سرفراز فرمائے، اور ان کی اجتہادی غلطیاں

سے درگذرے۔ (ایضاً ص ۱۸۸)

وہ مصر کے محمد سعید بے کی دینی حمیت اور ایمانی غیرت کے بھی معترف تھے، وہ جب لندن جارہے تھے، تو ان سے اٹلی میں ملے تھے، مصر میں انھوں نے شبان المسلمین کے نام سے ایک تنظیم قائم کی، جس کے ذریعہ سے انھوں نے وطن پرستی کے بجائے اسلام دوستی کی تلقین کی، اس کی ایک شاخ یمن میں بھی کھولی، تو سید صاحبؒ کو اس کا رکن بنایا، وہ مصر کی پارلیمنٹ کے ممبر بنے، تو انھوں نے اس کی کوشش کی کہ وہاں کوئی ایسا قانون نہ بنے، جو اسلام کے خلاف ہو، ۱۹۴۳ء میں ان کی وفات ہوئی، تو سید صاحبؒ نے لکھا کہ انکی ذات مصر کے نوجوانوں کے درمیان صحیح رہنمائی کی کفیل تھی (ایضاً ص ۲۰۱)

اہلیہ کا ماتم | ۱۹۱۷ء میں سید صاحبؒ کی پہلی بیوی کی وفات ہوئی، تو معارف کے شذرات میں ان کا بڑا دردناک ماتم کیا، ان کو وہ عفت و وفا کا پیکر سمجھتے تھے، اس لیے ان کی دائمی جدائی پر ان پر لکھا کہ استاذ مرحوم کی وفات کے بعد یہ دوسرا سانحہ ہے، جس نے میرے سکون خاطر کو درہم برہم کردیا ہے، وہ ان کی موت کو اپنی حیات منزلی کی بربادی سمجھتے اس لیے مرگ یار کے عنوان سے ایک نوحہ بھی لکھا جس کا پہلا شعر یہ تھا۔

ہم سفر وادی ہستی میں وہ دلبر نہ ہوا
شمع اس راہ میں اس کا رخ انور نہ ہوا (ایضاً ص ۳۵-۳۴)

سید صاحبؒ غایت اضطراب اور انتہائی الم کی حالت میں اپنی رفیقۂ زندگی کی رحلت پر اپنے غم ناک جذبات کا اظہار معارف کے شذرات اور صفحات پر کرگئے، آیندہ چل کر ان کی دوسری بیوی کی بھی وفات ہوئی، پھر ان کے بہت ہی ہونہار داماد کا انتقال عین جوانی میں ہوا، اور ان کی سب سے بڑی لڑکی کی بھی وفات پورے شباب کے زمانہ میں ہوئی، مگر ان میں سے کسی کا ذکر معارف کے صفحات میں کرنا پسند نہیں کیا، یہ ان کی عالی ظرفی اور ضبط غم کی دلیل تھی،

بیگم بھوپال کی رحلت پر ماتم | سید صاحبؒ بھوپال کی سلطان جہاں بیگم کی صفاتِ عالیہ سے بہت متاثر تھے، اس لیے کہ وہ نہ صرف اسلام کی بلکہ مشرق کی وہ آخری تاجدار خاتون تھیں، جن کے کارناموں پر دوسرے سلاطین اور امراء رشک کر سکتے تھے، سید صاحبؒ کی نظر میں وہ مشرقی و مغربی تعلیم و تمدن کا ایسا مجمع البحرین تھیں، جو آج مصلحینِ امت کا آئیڈیل ہے، وہ نہ صرف فرماں روا تھیں، بلکہ ہندوستانی خواتین کی رہنما، مذہبی علوم و فنون کی سب سے بڑی سرپرست، ہندوستان کی معتدل نسوانی اصلاحات کی سب سے بڑی مصلح، مسلمان عورتوں میں سب سے بڑی کثیر التصانیف اور سب سے بہتر مقررہ تھیں، سید صاحبؒ ان کی عزت اس لیے بھی کرتے، کہ ان کا حقیقی شرف ان کی مذہبی گرویدگی، دینی عقیدت اور ایمانی جوش و ولولہ تھا، وہ ہر قومی، مذہبی اور علمی تحریک پر سب سے پہلے لبیک کہتی تھیں، پھر ان کے اور اوصاف کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔ کہ سلطانہ مرحومہ کی ہستی میں رعب و شفقت کی عجیب آمیزش تھی، ان کے اخلاق میں عجیب کشش تھی، ان کا دربار حد درجہ سادہ ہوتا تھا، دربار کے آداب بھی تمام شرعی تھے، پردہ کے پیچھے وہ تشریف رکھتی تھیں، کورنش تسلیمات، رکوع اور سجود کا وہاں دخل نہ تھا، سب سے پہلے سلام کی بلند آواز انکی طرف سے آتی تھی، شاید ہی کوئی ان سے ملا ہو، اور ان کے اخلاق و معلومات کی وسعت سے متاثر نہ ہوا ہو۔

خود سید صاحبؒ ان سے کئی مرتبہ ملے، لکھتے ہیں، کہ ہر دفعہ دیر تک وہ اس اخلاق سے مصروفِ کلام رہیں، کہ وہ یہ بھول جاتے کہ وہ کسی خودمختار فرمانروا سے باتیں کر رہے ہیں، سید صاحبؒ ان کی عزت اسلئے بھی کرتے کہ وہ رسول پاک علیہ الصلوٰۃ والسلام سے بے مثال عقیدت رکھتی تھیں، ان کی گفتگو، تقریر، تحریر ہر چیز سے ان کا یہ جذبہ ظاہر ہوتا، سید صاحبؒ ان کو خادمۂ ملت اور مخدومۂ امت سمجھتے، اور اسی حیثیت سے آخر میں ان کا ماتم اس انداز میں کرتے ہیں۔

"سلطانہ تو آج سب سے بڑے سلطان کے دربار میں حاضر ہے، تیری ایک ایک نیکی

انشاء اللہ اس دربار میں سفارشی ہوگی، قبولِ مغفرت کا تاج تیرے سر پر ہوگا، اور رضا و خوشنودی کے مروارید تیرے گلے میں ہوں گے، سلطانہ زمانہ ہزاروں کروٹیں لے گا مگر تجھ کو نہ پائے گا، تاہم تیری زندہ جاوید نیکیاں تجھ کو تا ابد زندہ رکھیں گی۔

هرگز نمیرد آنکه دلش زنده شد به عشق
ثبت است بر جریدهٔ عالم دوام ما" (ایضاً ص ۱۰۲-۱۰۱-۱۰۰)

سید صاحبؒ کے نالہ و شیون کا ایک طریقہ یہ بھی تھا، کیسا دردناک اور کیسا غمناک ہے، بیگم بھوپال کی یہ ساری خوبیاں سید صاحبؒ نے اس لیے بھی بیان کی ہیں، کہ اگر کسی ملک کی کوئی خاتون فرماں روائی کرنا چاہے، تو وہ اپنے میں وہی اوصاف پیدا کر سکتی ہے، جن کے نمونے سلطانہ مرحومہ کی سیرت اور زندگی میں دیکھے گئے۔

تتمہ | میری یہ تحریر ضرورت سے زیادہ طویل ہو گئی ہے، مگر اس کتاب میں لذیذ انداز میں جو لذیذ حکایتیں بیان کی گئی ہیں، ان کی شیرینی سے یہ تحریر طویل ہوتی چلی گئی، اس کے زیادہ تر ٹکڑے تو خود سید صاحبؒ علیہ الرحمہ کی تحریروں کے ہیں، یہ نہ لیے جاتے تو شاید تسلسل بیان میں وہ لذت نہ رہتی، جو اس کی متقاضی تھی، اس اخذ و استفادہ کی ایک صورت تو یہ تھی کہ اس کتاب کی ماتم گساری کے چند نمونے پیش کر کے اکتفا کر لیا جاتا۔ مگر اس .... اختصار سے اس دور کے اربابِ فضل اور اصحابِ کمال کی پوری مرقع آرائی نہ ہوتی، اور نہ جس شرافتِ نفسی سے سید صاحبؒ نے اپنی قدردانی اور جوہر شناسی کا اظہار کیا ہے، اس کی تصویر سامنے آتی۔ زیرِ نظر کتاب ایک وفات نامہ معلوم ہوتی ہے، مگر راقم نے اپنی اس تحریر کی ذیلی سرخیوں میں علماء، فضلاء، اربابِ دانش، اصحابِ سیاست، حتیٰ کہ غیر مسلموں کو علٰحدہ علٰحدہ کر کے ان کی جو ماتم گساری دکھائی ہے، اس سے

اس کتاب کی کیفیت اور قدر و قیمت میں ضرور اضافہ ہو جائے گا، یہ لکھنے میں تامل نہیں، کہ
اس میں جن مرحومین کا ذکر آیا ہے، ان کا مطالعہ معروضی انداز میں نہیں کیا گیا ہے، آج کل کی
اصطلاح میں جو چیز معروضیت کہلاتی ہے، اس سے شائستہ اور مہذب انداز میں آبرو ریزی،
سطوت شکنی اور دل آزاری کا بھی کام لیا جاتا ہے، اس کتاب میں معروضیت کے بجائے
موضوعیت ہے، جس میں نیک طبعی، خیر اندیشی اور سلامت روی کے جوہر زیادہ پائے جائیں گے،
اس میں استاذ کیلئے شاگردوں کی محبت، شاگردوں سے استادوں کا گہرا لگاؤ، پیر طریقت سے
ایک مرید کی شیفتگی، پھر فضل و کمال، سخنوری، سخن شناسی، زہد و ورع، وضع طبع، دینداری، کردار
کی پختگی، سیرت کی استواری، حق گوئی، بے باکی، سیاست میں سچی خدمت گذاری، علم نوازی
اور ہنر پروری کے مروارید چمکتے نظر آئیں گے، پھر جب .... یہ خیال آتا ہے
کہ سید صاحبؒ یہ تحریریں اس وقت لکھ رہے تھے، جب وہ خود یگانۂ روزگار، استاذ کل اور
جوئے شیر اسلامیہ کے فرہاد بن چکے تھے، تو ان کے مطالعہ کی نوعیت میں ایک خاص قسم کی
علمی روحانیت اور روحانی لذت پیدا ہو جاتی ہے، پوری کتاب میں کہیں ان کے انا اور پندار
یا ان کی خودستائی، اور خود بینی کا اظہار نہیں ہونے پایا ہے، بہت سے ایسے مقامات آئے ہیں،
جہاں ان کو اپنے کو ابھارنے کا موقع تھا، مگر وہاں بھی نفس کشی اور عجز سے اپنے کو مٹا اور
دبا کر پیش کیا ہے، ان کی یہ جبلی معصومیت ان کی نجی اور معاشرتی زندگی میں بھی نظر آتی رہی
پھر ان کے اس وصف سے ان کی زیر نظر کتاب کی تحریروں میں، ایک خاص قسم کی جان،
آن، بان اور شان پیدا ہو گئی ہے، اس میں انکی زبان کو انکے انداز بیان اور انکے انداز بیان
کو ان کی زبان سے برابر سہارا ملتا رہا، کہیں زبان ان کے قلم کے جلو میں رہی، کہیں
ان کا انداز بیان تحریر کا ہم رکاب رہا، اور جہاں دونوں مل گیے ہیں، وہاں ان کی

تحریر جگمگا اٹھی ہے، ان کا نوحہ نغمہ بن گیا ہے، ایسی تحریروں کے پڑھنے کے بعد یہ کہنے میں تامل نہیں، کہ
بعض اوقات غم ناک تحریریں شیریں نغمے بن جاتے ہیں، پھر اس کتاب کی بڑی خصوصیت یہ بھی ہی،
کہ مجموعی حیثیت سے یہ بیسویں صدی کی تذکرہ نگاری ڈی لکس اڈیشن ہے، یہ تحریریں
زیادہ تر معارف کے شذرات میں لکھی گئیں، ان کے متعلق سید صاحبؒ خود لکھتے ہیں،
"ان صفحات میں مرحوموں کا ذکر اس لیے ہوتا ہے کہ ہماری آیندہ نسلوں کو اپنے
پچھلوں کے نام نیک کی خبر رہے، اسلامی تاریخ کا ایک بڑا کارنامہ وفیات یعنی
ہزاروں لاکھوں بزرگوں فاضلوں، ادیبوں، اور ممتاز لوگوں کی وفات کی تاریخ
کا تعین ہے، تاریخ کی اس صنف پر بہت سی کتابیں مدون ہوئیں، کیا عجب ہے، کہ
شذرات کا یہ حصہ ایک دن اس عہد کے وفیات کے اوراق بن جائیں"
پیشین گوئی صحیح ثابت ہوئی، اب جب کہ یہ شذرات ایک کتاب کی صورت میں
یادرفتگاں کے نام سے شائع کر دیے گئے ہیں، تو یہ نہ صرف غم ناک جذبات بلکہ ادب
دانشاء کے بھی سونے کے ٹکڑے بن گئے ہیں۔

ایک بار پھر دہرانے کو جی چاہتا ہے کہ مولانا محمد علی اور علامہ محمد اقبال پر حضرت
سید صاحبؒ کی ماتمی تحریر نوحہ گری کی اعلیٰ ترین مثال ہے، اس سے بہتر ان نادرۂ
روزگار مشاہیر پر بڑے سے بڑے ادیب اور اہل قلم نے ماتم گساری نہیں کی، ان کو لکھے ہوئے
پچاس سال گذر چکے ہیں، مگر اس کی دردناکی اور الم ناکی میں تازگی اب بھی محسوس ہوتی
ہے، آیندہ جب کبھی اردو کے ادبی شہ پارے ایک جگہ جمع کیے جائیں گے تو ان
تحریروں کو اس میں شامل کرنا لازمی ہوگا، اسی طرح بہار کے مولانا سجاد نائب امیر
شریعت بہار پر جو کچھ لکھا ہے، وہ بھی سید صاحبؒ کی دل سوزی و جگر کاوی بلکہ

سینہ کوبی، ماتم سرائی کی ایک اعلیٰ مثال ہے، نواب حبیب الرحمن خاں شیروانی پرانی ماتم گساری میں جو ادب، احترام، رتبہ شناسی، عظمت کی قدر دانی نظر آتی ہے، وہ پرانی قدروں کی یاد تازہ کرتی ہے، وقار الملک، حکیم اجمل خاں، ڈاکٹر مختار احمد انصاری مولانا حسرت موہانی، مسٹر مظہر الحق، مسٹر علی امام اور جسٹس امیر علی کی ماتم گساری کا انداز ہوگا کہ سیاسی عقیدے اور مسلک میں فرق کے بغیر جس میں جو جوہر ہوتا، اس کا اعتراف کھلے دل سے وہ کرتے، ہر مکتب فکر کے علماء، اور ارباب فضل و کمال کا اعتراف کرتے، اپنی بصیرت اور طبعی شرافت کا ثبوت دیتے، ان کی زندگی میں ان کی ماتمی تحریروں پر بعض مشاہیر نے لکھا کہ ان کی وفات بھی سید صاحبؒ کی زندگی میں اگر ہو جاتی تو ان ماتم گسارانہ تحریروں کے ذریعہ وہ بھی زندۂ جاوید ہو جاتے، آج بڑے سے بڑے ادیب و انشا پرداز ہیں، وہ بھی ماتمی تحریریں لکھتے ہیں، لیکن ان میں وہ ایجاز، وزن، وقار، متانت، درد، سوز اور الم نظر نہیں آتا جو یادِ رفتگاں میں ہے، اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ سید صاحبؒ نے اپنی تصانیف میں علم کا سونا محلول کیا ہے، یادِ رفتگاں میں دل کی کیفیات میں جنبش پیدا کر کے جس انداز بیان میں ان کو قلمبند کیا ہے، اس سے پڑھنے والوں کے دلوں میں ہلچل پیدا ہونا لازمی ہے۔

یادِ رفتگاں

مولانا سید سلیمان ندویؒ نے اپنی زندگی میں خود اپنے استاذ مولانا شبلی نعمانیؒ اپنے دوسرے اساتذہ، اپنے پیر طریقت، اپنے احباب معاصرین، اور مختلف طبقۂ زندگی کے مشاہیر و اکابر کی وفات پر معارف کے شذرات میں یادنیات کے تحت جو غم ناک اور المناک تحریریں لکھی تھیں ان کو اس کتاب میں جمع کر دیا گیا ہے۔ طبع سوم عکسی، معارف پریس، اعظم گڈھ۔

قیمت ۲۰/۔ روپے

راجہ رام نراین موزوں

اور

ان کا کلام

از ڈاکٹر شمیم اختر صاحبہ، بنارس

(۲)

عشق و محبت کی راہ میں ایک ایسی منزل بھی آتی ہے، جب محبوب کے تغافل و بے اعتنائی اور رقیب کے ساتھ اس کے التفات کا شک و گمان عاشق کے دل میں پیدا ہوتا ہے جس کو وہ محبوب کی بے وفائی اور عہد کی بے ثباتی پر محمول کرتا ہے، موزوںؔ نے ان کیفیتوں کو بھی نظم کیا ہے، چند شعر ملاحظہ ہوں۔

بے وفائی و بے ثباتیِ عہد — این قدر از تو دیدہ ام کہ مپرس

چشم خوباں چہ قدر رنگ تلون دارد — کہ زما میشود و گاہ زما میگردد

جاناں عبث بسوئے رقیباں گذشتہ — مارا ز جور تیغ تو کے انحراف بود

لیکن محبوب کے تغافل اور رقیب کے ساتھ التفات کے سبب بدگمانیاں پیدا تو ہو سکتی ہیں، مگر عاشق بدگمانی پر قابو پالیتا ہے، چنانچہ موزوںؔ کا شعر ہے۔

مہرباں ست بر رقیب مگو — باورم نیست یار کسی ست

اس موضوع کو مرزا غالبؔ نے یوں نظم کیا ہے۔

رشک کہتا ہے کہ اسکا غیر سے اخلاص حیف — عقل کہتی ہے کہ وہ بے مہر کس کا آشنا

فرقت اور ہجر کی حالت میں ایسے لمحات بھی آتے ہیں، جب عاشق کو محبوب کی آمد کی امید نظر آتی ہے، اور وہ بے سروسامانی کے عالم میں اپنی جان عزیز کو حقیر تحفہ قرار دے کر پیش کرتا ہے۔

نقد جان را از شرم نثارش سازم ۔۔۔ یاد می آید دچیزے دگرم حاضر نیست

مرزا غالب نے بھی اس موقع پر اپنی بے سروسامانی کو یوں بیان کیا ہے۔

ہے خبر گرم اُن کے آنے کی ۔۔۔ آج ہی گھر میں بوریا نہ ہوا

غالب ہی کا ایک دوسرا شعر ہے۔

وہ آئیں گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے ۔۔۔ کبھی ہم انکو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں

موزوں نے اپنی جان نثار کرنے کی پیش کش تو کی لیکن ان کے محبوب کا جواب ملاحظہ ہو۔

گفتم کہ نثار تو کنم جانِ گرامی ۔۔۔ گفتا کہ مرا چشم طمع بر دل و دین بود

محبوب کے آنے کی خوشخبری عاشق کو باد صبا سے ملی تھی لیکن اس کی قسمت میں مایوسی اور محرومی ہے۔

خبر از مقدم گل بصبح دمی صبا می گفت ۔۔۔ ہنوز منتظرم یار جا بجا چہ رسد

اور نامرادی کے ہجوم میں عاشق امید کا دامن نہیں چھوڑتا۔

چہ شد کہ دامنت امروز در کف من نیست
تاہم
گمان مبر کہ زدستم خیال فردا نیست

ایسے موقع پر مرزا غالب نے کہا تھا۔

سنبھلنے دے مجھے اے ناامیدی کیا قیامت ہے
کہ دامانِ خیالِ یار چھوٹا جائے ہے مجھ سے

پیہم مایوسیاں حرمان نصیب عاشق پر بہر حال اثر کرتی ہیں، اور وہ حیران ہے کہ

گشتم ضعیف لیکن شب فراق ۔۔۔ کوتہ نمی شود و بپایان نمی رسد

اس کے اضطراب و بے قراری کو موزوں نے اس طرح نظم کیا ہے۔

گہے بر بستر و گہ بر زمیں چو اشک افتم ۔۔۔ قرار ما بہ چنیں کرد بیقرار مرا

ہر چند عاشق دل کو سمجھاتا ہے کہ آہ و فغاں عندلیب چمن کو زیب دیتا ہے، عاشق کی شان پروانہ کی طرح خاموشی سے جل جانے میں ہے۔

بعندلیب چمن گو یہ و فغان داوند ۔۔۔ دلا خموش چو پروانہ نالہ کار تو نیست

لیکن دل نہیں مانتا، دراصل عشق و محبت کا لازمہ اور اس کی شان اشک و آہ سے وابستہ و مربوط ہے، جیسے بادشاہ سے اس کی سپاہ، بادشاہ کے جاہ و جلال کو برقرار رکھنے کے لیے سپاہ کا اس کے ساتھ ہونا لازم ہے۔

بے اشک و آہ دل نشود منضبط بہ عشق ۔۔۔ مانند خسروے کہ جدا شد سپاہ ازو

آہ و نالہ ہی دراصل عشق و محبت کا پیامی ہوتا ہے۔

دی قاصد آہ و نالۂ من ۔۔۔ گردید بملک غم روانہ

اور جب نوبت آہ و نالہ تک پہنچی تو سیلاب اشک کی آمد ضرور ہوئی، لیکن موزوں عاشق کے آنسوؤں کو صرف قطرۂ آب نہیں سمجھتے، جو زمین پر گرا دیئے جاتے ہیں، قطرات اشک دراصل موتی ہیں، جن کو محبوب پر نثار کیا جانا چاہیے۔

رائگاں اشک را مریز بخاک ۔۔۔ این گہر قابلِ نثار کسی ست

اشکوں کی روانی اسوقت رکی جب عاشق کے دل و جگر میں خون کا کوئی قطرہ باقی نہیں رہ گیا، اس لئے عاشق کو کہنا پڑا کہ

نماند قطرۂ خون در دلم نمی دانم ۔۔۔ چو دشمنی ست بما دیدۂ گہربار را

اور اس شکایت کی وجہ یوں بیان کی گئی ہے۔

حیف است انیکہ تشنہ رود مہمانِ ما
خون در جگر نماند و خدنگ تو می رسد

اسی شعر میں خدنگِ محبوب کا عاشق کے جگر میں مہمان بن کر پیوست ہونا، اور اس کی تشنہ روی موزوںؔ کی نازک خیالی کا نمونہ ہے۔

موزوںؔ کو اپنے کلام میں اشک و آہ اور نالہ و گریہ کی درد انگیزی اور اس کے تاثر کا احساس تھا، چنانچہ کہتے ہیں۔

نالہ داشت کہ گردوں زکسی یاد نداشت
در شبِ ہجرِ تو موزوںؔ بگرفتاری دل

موزوںؔ کے کلام میں سوز و گداز اور غم انگیزی بہ درجۂ اتم موجود ہے، اور دیوان کا افتتاح بجا طور پر درج ذیل شعر سے ہوا ہے۔

کہ زیبِ فاتحہ بسم اللہ ست قرار را
بہ آہ کنم افتتاح دیوان را

شیخ علی حزیںؔ کے سعادتمند شاگرد نے اپنے کلام میں سوز و گداز اور درد کی اثر انگیزی کو بھی اپنے استاد کے فیضِ تربیت کا مرہونِ منت قرار دیا ہے، چنانچہ کہتے ہیں۔

گفتا کہ بہ تعلیم گرش شیخِ حزیں بود
گفتم کہ ہمہ درد بود نالۂ موزوںؔ

رنگِ تصوف | موزوںؔ کی غزلیات میں عشق و محبت، تمنائے وصال، ہجر و فراق، نالہ و آہ کے مضامین اور طرزِ ادا سے ظاہر ہے، کہ ان کے دل میں عشقِ حقیقی کا جذبہ جاگزیں تھا، اور وہ اس مقام پر پہنچ چکے تھے، جو تصوف کے حدود کے اندر ہوتا ہے، چنانچہ ان کی غزلیات میں تصوف کا رنگ غالب ہے۔

تصوف کی اولین شرط یہ ہے کہ عشق صادق ہو، اور جب عشق صادق ہوتا ہے تو ہر شئے میں محبوبِ حقیقی کا پرتو نظر آتا ہے، موزوںؔ اس شرط کی پابندی کرتے ہیں، ثبوت میں مندرجۂ ذیل شعر کی

تکرار بے موقع نہیں۔

سنبلستان چو شنیدم ہمہ را بوئے تو بود
بہ گلستان چو رسیدم ہمہ جا رنگِ تو داشت

عشقِ حقیقی نگاہ حقیقت بین عطا کرتا ہے، موزوںؔ کہتے ہیں۔

ہمہ جا جلوۂ بہارِ کسی است
کو نگاہی کہ دیدہ افروزد

اور جو آنکھ ہر شے میں محبوبِ حقیقی کا مشاہدہ کر سکتی ہے، اس کے نزدیک کفر و ایمان، شیخ و برہمن کی تمیز و تفریق باقی نہیں رہتی، چنانچہ موزوںؔ ایک صوفی کی زبان سے کہتے ہیں۔

باہیچ کسم ہیچ سروکار نباشد
با شیخ بسازم و بسوزم بہ برہمن

دوسرا شعر ملاحظہ ہو۔

نہ حریمِ کعبہ سازد نہ درِ کنشت ما را
نہ خمارِ کفر و ایماں، نہ غمِ بہشت ما را

شعرا کے کلام میں تصوف کا بیان سمجھنے کے لئے صوفیوں کی اصطلاحات سے واقفیت ضروری ہے، مولانا شبلی نعمانیؒ نے شعر العجم کے حصۂ پنجم میں اس مقام اور مرتبہ کو واضح کیا ہے، جو اربابِ تصوف کے حلقہ میں مرشد کو حاصل ہوتا ہے۔ مرشد کو ہی عارفِ کامل بھی کہتے ہیں، اور شعراء ساقی اور پیرِ مغاں کے نام سے بھی مرشد مراد لیتے ہیں اور اصطلاحات از قسم میکدہ (میخانہ) جام و سبو، شیشہ و صراحی، نقل و گزک، خمار و تشنہ، درد، صبوحی، مطرب اور نغمہ استعمال کرکے عرفان کے بڑے بڑے واردات و مدارج کی نشاندہی کرتے ہیں، اور ان واردات و مدارج بالفاظ دیگر اسرار و رموز سے آگہی حاصل کرنے کے لیے مرشدِ کامل سے رجوع کرنا ضروری ہے۔

راجہ رام نارائن موزوںؔ کے کلام میں بھی صوفیانہ خیالات کے اظہار کے لیے ان ہی اصطلاحات کو استعمال کیا گیا ہے۔

موزوںؔ عاشقِ صادق کو دوائے دردِ دل کی جستجو میں مرشدِ کامل سے رجوع کرنے کا

مشورہ دیتے ہیں۔

گفتم دوائے دردِ غمِ روزگار چیست
گفتا کہ التجا بجنابِ مغان کنند

اور مرشد کی توجہ کی طلب میں کہتے ہیں۔

میخانہ است چشمِ سیہ مستِ آن نگار
یا رب شود نصیبۂ موزوںؔ نگاہ ازو

اس شعر میں نگار خود ساقی یعنی مرشد ہے، اور اس کی چشمِ سیہ مست اسرار و رموز کا خزینہ ہے، جس کو شاعر نے میخانہ سے تعبیر کیا ہے۔

اسرار و رموز یعنی عرفانِ الٰہی کا خزینہ بھی بہت بڑی قیمت ادا کر کے ہی حاصل ہو سکتا ہے۔ اور سب سے بڑی قیمت جو عاشقِ صادق ادا کر سکتا ہے، وہ دین و ایمان کی دولت ہے، یہ قیمت ادا کرنے کے بعد طالبِ عرفان اگرچہ تہیدست ہو جاتا ہے لیکن عرفانِ الٰہی کا جو نشہ حاصل ہوتا ہے وہ دائمی ہوتا ہے، چنانچہ موزوںؔ فخریہ کہتے ہیں۔

کنوں اسیرِ خمارم دریں تہیدستی
کہ صرفِ بادہ نمودیم دین و ایمان را

اور

منم کہ ساحتِ میخانہ سجدہ گاہِ من است
حریمِ درگہِ پیرِ مغان پناہِ من است

میخانہ سے آنکھیں مراد ہیں، اور ساحت کے معنی کشادگی یا فضائے مکان ہے، اس لیے ساحتِ میخانہ سے مراد آنکھوں کے ارد گرد ہے۔

عرفان کی اس منزل تک پہنچنے کے لیے زاہد دیندار کو بھی دشوار گذار راہوں سے گذرنا پڑتا ہے۔ جب تک زاہد کو اپنے زہد و تقویٰ کا احساس و گمان رہتا ہے، رندانِ خرابات سے کنارہ کشی اس کا شیوہ ہوتا ہے۔ ؎

ہو پیرِ مغان از سرِ تقویٰ زاہد
دامن افشان گذرد در رہِ غزلخوان گذرد

لیکن طمطراق جبہ و دستار کے باوجود زاہد کا دل بھی اسرار و رموزِ الٰہی کی طلب سے خالی نہیں رہتا اور اس کی زندگی میں وہ لمحہ آتا ہے، جب اس کے دل میں مرشدِ کامل کی تلاش شروع ہوتی ہے، اور وہ محسوس کرتا ہے۔

تمام عمر تلف گشت بہ زہد و ریا
بطاقِ ابروئے او ساعتے نماز کنند

او سے مراد مرشدِ کامل ہے، لیکن عرفانِ الٰہی و معرفت کی شراب حاصل کرنے کے لیے جبہ و دستار کے طمطراق کو ترک کرنا ہوگا، چنانچہ موزوںؔ خبردار کرتے ہیں۔

اے شیخ مرو سوئے خرابات کہ ترسم
از شوقِ میت جبہ و دستار نباشد

زاہد ساری عمر جبہ و دستار کے جاہ و جلال میں گرفتار رہا ہے، اس لئے اس جاہ و جلال کا یک بیک ترک کر دینا اس کے لیے ممکن نہیں لہٰذا موزوںؔ مرشدِ کامل سے مخاطب ہوتے ہیں۔

ساقی خبرت نیست ز حالِ دلِ زاہد
جائے دگرش دہ کہ خبردار نباشد

اور جب مرشد کی نگاہ دلربا اپنا کام کر لیتی ہے تب

نمی دانم چہ دید از زہد و تقویٰ چشمِ حق بینش
کہ از میخانہ شیخِ شہرِ ما سرشار می آید

اور

ہمان زاہد کہ از زہد و ثقاہت لاف ہا می زد
سبوئے مے بدوش از خانۂ خمار می آید

موزوںؔ کے کلام میں تصوف کا بیان ان کی ایک غزل کے چند اشعار پر ختم کیا جاتا ہے۔

زاہد کلامِ پیرِ مغان بے گزاف بود
میخانہ پایگاہ ملائک مطاف بود

غیر از دلِ شکستہ کسی درمیان نبود
با غم مرا شبی کہ قرارِ مصاف بود

کیفیتِ نگاہ تو گر چارہ گر نہ شد
چون بہر جام دردکشان بادہ صاف بود

آمد برون و از درِ میخانہ شاد رفت
چندانکہ شیخ در گروِ اعتکاف بود

طفلان مرا زہر طرفی سنگ می زدند | کے درمیانِ دہر و حرم اختلاف بود
پیری حجاب عیب جوانی نمی شود | قد خمیدہ بہ نشانی چو کاف بود
موزون چرا بشاہد و ساغر نساختی | درکیش می فروش گناہت معاف بود

اخلاقی شاعری

راجہ رام نراین موزون کا رجحان طبع خدا پرستی کی جانب تھا، اور وہ وجود الٰہی کے نہ صرف قائل تھے، بلکہ باری تعالیٰ کو حاضر و ناظر بھی سمجھتے تھے، جو لوگ خدا تعالیٰ کے سمیع و بصیر ہونے کے قائل نہیں انھیں موزون کا مسکت جواب ہے کہ خدا سمیع و بصیر ہے، البتہ تمھارے پاس آنکھ اور کان نہیں ہیں، اس لیے تم خدائے تعالیٰ کو دیکھنے اور اس کی آواز سننے سے قاصر ہو۔

آن کہ گوید کہ خدا نیست سمیع و بصیر | دیدہ کو گوش کجا بہر خدا ہوشش باد

ان کا قول تھا کہ اگر انسان کی تدبیر کارگر ثابت نہ ہو تب بھی مایوس نہیں ہونا چاہئے، بلکہ اللہ تعالیٰ پر بھروسہ قائم رکھنا چاہیے۔

موزون اگر نماند بدستِ تو چارۂ | آن بہ کہ تکیہ بر کرمِ چارہ ساز کن

اگر انسان پاک طینت و صاف دل ہے، تو اس کے مزار کے پتھر میں بھی آئینہ جیسی جلا پیدا ہو سکتی ہے۔

بخشد صفا بر آئینہ سنگ مزار او | ہر پاک طینتی کہ دلِ بے غبار داشت

موزون کو دنیا کی بے ثباتی کا احساس تھا۔

شمع تا صبح بود گل دو سہ روزے ماند | دولتی کیست کہ در دہر بقائے دارد
بہ باغ دہر کہ نے گل و نے ثمر ماند | غنیمت ست کہ اخلاص یکدگر ماند

دنیا کی بے ثباتی کے احساس نے ان کے اندر عجز و انکسار بدرجۂ اتم پیدا کر دیا تھا، ان کے دیوان میں اس موضوع پر اشعار بہت ہیں، یہاں ایک شعر نقل کیا جاتا ہے، جس سے واضح ہوگا کہ موزون

اپنی خاکساری کو ہی اپنے اوج مرتبہ کا زینہ سمجھتے تھے۔

زخاکساری ما می بود حسد گردون | رسیدہ است بہ معراج اوج پستی ما

ان کا اصول تھا کہ عاجز و مجبور کو حقارت کی نگاہ سے نہ دیکھنا چاہئے، بلکہ اس کی ہر قسم کی امداد کرنی چاہئے، چنانچہ کہتے ہیں۔

چرا پا می زنی گر می توانی دستگیری کن | اگر بر خاک افتادہ ببینی خاکساران را

موزون کے اخلاقی اقدار میں خاکساری اور خودداری کے درمیان کوئی تضاد نہ تھا، وہ کہتے ہیں۔

خوشم بسوز خود اے چشم گریہ سر نکشی | کہ تشنہ مردن من[1] بہ ز آب ہمسایہ

موزون نیک نامی کی زندگی کو ترجیح دیتے تھے، مبادا مرنے کے بعد نفرت کے ساتھ یاد نہ کیے جائیں، دو شعر ملاحظہ ہوں۔

مدعا بسیار در طول حیات افتادہ است | جز نکو نامی نباشد انتخاب زندگی

اور

چنان موزون معاش خویش را در زندگانی کن | کہ بعد از مردنت ہمرہ نگردد بانگ نفرینی

کلام موزون :-

انقلاب زمانہ سے فارسی علم و ادب کا ہندوستان میں زوال نہیں خاتمہ ہو چکا تھا، اور راجہ رام نراین موزون کے زمانہ میں اردو زبان فارسی کی جگہ لے رہی تھی، مگر فارسی شعر و شاعری کا چلن ہنوز باقی تھا، خواجہ حافظ کے دیوان سے فال نکالنے کا عام رواج تھا، چنانچہ موزون نے فنِ شعر گوئی کا آغاز بھی دیوان حافظ سے فال نکال کر کیا تھا، جس کا اعتراف

---

[1] موزون کے حالات زندگی میں مرقوم ہو چکا ہے، کہ ۳ روز تک پیاسا رکھکر جب ان کو پانی دیا گیا تو انھوں نے پانی زمین پر پھینک دیا۔

انھوں نے ایک شعر میں یوں کیا ہے۔

بشارت است کہ فرمود حافظ شیراز   سخن بگوئے کہ طبع لطیف موزوں است

اور استاد کی حیثیت سے موزوں کو شیخ علی حزیں ملے تھے، جن کے کمال شاعری کا لوہا انکے مخالفین بھی مانتے تھے، چنانچہ حزیں سے شرف تلمذ پاکر موزوں کو اپنے اوپر یک گونہ اعتماد پیدا ہوگیا تھا، جس کا اعلان انھوں نے برملا کیا تھا۔

موزوں زخطر درہ باریک معانی   اندیشہ مکن مثل حزیں راہبری ہست

چنانچہ حزیں کی تربیت اور ان کے کلام کے تتبع سے موزوں کے کلام میں سوز و گداز کے ساتھ مستی، ادا بندی اور مضمون آفرینی پیدا ہوگئی تھی، جو ان کے عاشقانہ اور صوفیانہ کلام سے ظاہر ہے۔ موزوں خیالات کے اظہار میں تمثیلات سے کام لیتے ہیں، جو شعرائے عجم میں مرزا صاحب کا خاص انداز تھا، زبان کی فصاحت، ترکیب کی بندش اور روزمرہ و محاورات کا استعمال بھی انھوں نے بطرز صائب کیا ہے، اور ان کو اپنے کلام پر مرزا صائب کے انداز کلام و طرز ادا کا احساس تھا، چنانچہ انھوں نے اپنی ایک غزل کے مقطع میں اس کا اعتراف ہی نہیں فخریہ دعوی کیا ہے، شعر ملاحظہ ہو۔

بفیض مرتبت حضرت حزیں موزوں   نظیر طرز نظیری و صائبا شدہ ام

موزوں کے کلام میں اشعار کی آمد خاص کر چھوٹی بحروں میں بلا تکلف ہو کر گفتگو کا تاثر پیدا کرتی ہے۔ ایک غزل کے چند شعر ملاحظہ ہوں۔

گر بہ گلشن بہار می آید   بے رخت کے بکار می آید

بے لب لعلت آب حیوان ہم   طبع را ناگوار می آید

پہ دہائے فشاندم ہوس است   یار بہر شکار می آید

چھوٹی بحر کی ایک دوسری غزل کے بھی چند شعر ملاحظہ ہوں۔

تسکین من و قرار بسمل   امریست محال و کار مشکل

از مردم دیدہ چون نہ پرسی   ہر جور کہ کرد گریۂ دل

خون من بیگناہ امروز   گردید حنائے پائے قاتل

بستند دل شکستہ ام را   در جائے درا بپائے محمل

درد تو بدل رفیق و مونس   داغت بجگر شریک و شامل

نگداز طلائے طاقتم را   داریم عیار عشق کامل

کو شہپر بخت تا رساند   من آبلہ پا و دور منزل

غزل کے اشعار میں زبان کی سادگی و صفائی اور شستگی کے ساتھ الفاظ کی نشست و ترکیب قابل لحاظ ہے، اگرچہ گریہ دل سے براہ راست مردم دیدہ متاثر ہوتی ہے، اور پائے قاتل کا تعلق خون بے گناہ سے ہے، شکستہ دل کی آواز ہی محمل کے لیے بانگ درا کی بدل ہوسکی، غزل کے پانچویں شعر میں طلائے طاقت کی مناسبت عیار عشق کامل سے بہت خوب ہے، رعایت لفظی کے لیے دو شعر ملاحظہ ہوں۔

پیوستہ بناوک نگاہش   باشد جگر و دلم نشانہ

مرغ دل من بزلف و خالش   گردید اسیر دام و دانہ

پہلے شعر میں ناوک جگر میں، نگاہ دل میں بالترتیب پیوست ہوتی ہے، اور دوسرے شعر میں مرغ دل کی گرفتاری کے لیئے زلف دام تیار کرتی ہے، اور دام میں خال دانہ کا کام کرتا ہے، ایک دوسری غزل کے چند شعر ملاحظہ ہوں۔

چشم و دلش ز گریۂ غم خونفشاں کنم   با ہر کسے کہ درد غم خود بیاں کنم

چون اشک آہ بسر ہم میرسد مرا   در حیرتم کہ گریہ کنم یا فغاں کنم

دارد خدنگ عشوہ نگاہی بسوئے من | تا چند احتیاط دل ناتواں کنم

باشی اگر بنالہ سرائی رفیق من | اے دل چرا متابعت بلبلاں کنم

دوسرے شعر کے پہلے مصرعہ میں اشک بھی ہے اور آہ بھی، اسی رعایت سے دوسرے مصرعہ میں بالترتیب گریہ اور فغاں استعمال ہوتے ہیں، تیسرے شعر میں عشوہ ... نگاہی، بطور خدنگ اور چوتھے شعر میں "متابعت بلبلاں" کی نادر ترکیبوں سے شعر میں زور پیدا ہو گیا ہے۔ اور آخری شعر میں عقل اور دل کی کشمکش میں عقل کی خود سپردگی موزون کے فلسفہ عشق کا بیان ہے، موزون کے نزدیک دل کے پاس "پاسبان عقل" کا رہنا لازم نہیں ہے، بلکہ آتش نمرود میں عشق کا بے خطر کود پڑنا ہی لازم ہے۔

حسن تعلیل | موزون نے اپنے کلام میں صنعت حسن تعلیل سے بھی زور پیدا کیا ہے، ان کا شعر ہے۔

گفتم کہ چرا لالہ بداغ جگر آید | گفتا کہ دل سوختہ زیر زمین بود

مرزا صاحب اس مضمون کو یوں ادا کرتے ہیں۔

یادگار جگر سوختۂ مجنوں است | لالہ چند کہ از دامن صحرا برخاست

موزون کا شعر مرزا صائب کے شعر پر ہر نوع فوقیت رکھتا ہے، موضوع کی مناسبت سے مرزا غالب کی اردو غزل کا ایک فلسفیانہ شعر یاد آتا ہے۔

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں | خاک میں کیا صورتیں ہونگی کہ پنہاں ہو گئیں

اس ضمن میں موزون کا ایک شعر اور ملاحظہ ہو۔

یارب کدام چشم تر از خاک من گذشت | صد لخت دل چو گل بمزارم فتادہ است

اولیائے کامل کے مزار پر گل پوشی کی جاتی ہے، موزون کے نزدیک برگہائے گل دراصل لخت جگر ہیں جو اشکوں کی صورت میں کسی کی چشم تر سے مزار پر ٹپک کر پھول کی شکل میں بکھر گئے ہیں۔

موزون کا ایک شعر گناہوں کے جواز میں بھی ملاحظہ ہو۔

در کثرت خویشتن گناہم | بہر عفو تو شد بہانہ

کسی اردو شاعر نے اسی مضمون کو یوں ادا کیا ہے۔

بندہ نواز یوں پہ خدائے کریم تھا | کرتا نہ میں گنہ تو گناہ عظیم تھا

ایک دوسرا شعر حسن تعلیل کے ضمن میں ملاحظہ ہو۔

بگوشۂ خم ابرو بجاست خال سیاہ | چہ نقطہ ایست کہ این بیت انتخاب ساخت

محبوب کے دونوں ابروؤں کو ایک بیت قرار دیا ہے۔

موزون نے چمن میں اپنی نغمہ سرائی کا جواز اور سبب درج ذیل شعر میں بیان کیا ہے۔

لالہ شد داغ دل بلبل شیدا خون گشت | تا کہ موزون بچمن نغمہ سرائی گردد

لیکن عرض ہے کہ لالہ داغ دل اور بلبل شیدا کے خون گشتن موزون کے لیے نغمہ سرائی کا مناسب موقع نہیں، بلکہ موزون دلی باید تر ابیماری باید۔

تصوف کی منزل پر پہنچ کر صوفیہ وجود الٰہی کا ادراک اپنے وجود میں کرتے ہیں، چنانچہ ولی کامل منصور حلاج نے بھی اپنے وجود میں وجود الٰہی کا ادراک کیا، اور اس رمز کو انا الحق کہہ کر فاش کر دیا، جس کے جرم میں اہل نظر نے منصور کو دار پہ لٹکا دیا تھا، صوفیہ اب اس راز کو منکشف نہیں کرتے اس کی علت موزون نے نظم کی ہے۔

منصور را بدار کشیدند عاقبت | اخفائے سر عشق برائے ہمیں کنند

تلمیحات | ماحول، تربیت اور فارسی علم و ادب سے وابستگی کے سبب اس زمانہ کی اعلیٰ سوسائٹی کی تہذیب اور تمدن موزون کے اندر رچ بس گئی تھی، چنانچہ اپنے شاعرانہ جذبات کے اظہار کے لیے موزون نے فارسی زبان کو استعمال کیا، اور زبان کے ساتھ اصطلاحات بھی وہی استعمال کیں

جن کا رواج فارسی شعرائے ہند نے جاری رکھا تھا، چنانچہ موزوںؔ کے کلام میں تلمیحات بھی وہی ملتی ہیں
جو دیگر شعراء نے اپنے کلام میں استعمال کی ہیں۔ دو شعر درج کئے جاتے ہیں۔

ہم سلسلۂ حضرت خضر ست خیالش   آنرا کہ بزلف سیہ یار سری ہست
سبزۂ لعل تو خط بر لب یاقوت کشید   این طراوت رقم خامۂ بہزاد نداشت

ان کے دیوان میں صرف ایک شعر ملتا ہے، جس میں انھوں نے نل دمن کو جگہ دی اور وہ
بھی قافیہ کی سہولت کے سبب اور وہ یہ ہے۔

شنید ہر کہ حدیثی ز عشقبازی من   نشست خسرو شیریں و نل دمن را سوخت

تشبیہات | تشبیہات اور استعارات کلام میں جان ڈال دیتے ہیں، موزوںؔ نے اپنے کلام
میں تشبیہات اور استعارات کا استعمال کیا، اور اس طرح کیا کہ کلام میں سلاست اور روانی
دوبالا ہو جاتی ہے، مقالۂ ہذا میں عشقیہ اور صوفیانہ مضامین کے ضمن میں مندرج اشعار میں
تشبیہات نمایاں ہیں، مثلاً محبوب کے قد کو شمشاد و سرو سہی سے، زلف کو سنبل سے، نالہ کو
بانگِ جرس سے مشابہت دی گئی ہے۔ چند شعر اور ملاحظہ ہوں۔

نارنگ چہرہ ام شد جوشِ بہار عنقا   نایابی است دائم آئینہ دار عنقا
عزلت بود نصیبم تا این بلند نامی   کس را خبر نباشد از کار و بار عنقا
ہر چند سعی کردم کم یافتم سراغی   شہ طالع رسایم شاید سوار عنقا

عنقا نایابی کی علامت ہے، اور شعر میں نایابی کے اظہار کے لیے عنقا سے مشابہت دی گئی ہے۔

صبح آن نازک بدن مست شراب آمد برون   بے تکلف در نظر ہا آفتاب آمد برون

مانند حباب شیشۂ دل   ہر جا شکند صدا ندارد
ہر بوالہوس زند دمِ عشق   گر یار سر جفا ندارد

قوس قزح ار چہ مشکل ابرو ست   یک عشوۂ دلربا ندارد

رباعیات | دیوان موزوںؔ میں غزلوں کے علاوہ رباعیات بھی ہیں، جن کی تعداد ۹۰ کے قریب
ہے، ان کی رباعیات کے مضامین اخلاقی تعلیمات ہیں، عاشقانہ و صوفیانہ مضامین بھی شامل ہیں،
چند رباعیوں میں اہل بیت سے عقیدت کا اظہار کیا گیا ہے، چند رباعیاں اس موضوع کی ملاحظہ ہوں۔

فرمود چو بہ نبی خدا نادِ علی   ما نیز کنیم روز و شب یادِ علی
خواہی کہ شود مشکلت آسان بدل   ہمت ز علی بخواہ و ز اولادِ علی

ای نور دو دیدہ ولایت حسنین   ای ترجمۂ حدیث و آیت حسنین
ای معنی ذوالفقار و اعجاز رسول   ای قوتِ بازوی ہدایت حسنین

بخیال اختصار اسی موقع پر لکھ دینا مناسب ہے کہ دیوان موزوںؔ میں حضرت علیؓ کی شان
میں تیرہ اشعار پر مشتمل ایک منقبت ہے۔
چند رباعیات متفرق مضمون کی لکھ کر یہ مقالہ ختم کیا جاتا ہے۔

از باغ جہان باد سحر خواہد رفت   رنگ گل و خوبی ثمر خواہد رفت
چون غنچہ غم بہار خوں کردہ ام   کاین قافلہ آخر ز نظر خواہد رفت

دل از غم روزگار پر غمگین ست   بے طاقت و بے قرار و تسکین ست
افتادہ دست یار و ہرگز نشکست   این شیشہ ندانم چہ قدر سنگین ست

خلقی بغرور نوجوانی مغرور   جمعی بہ فور کامرانی مسرور
یاقوت ضعف خویش از وضع جہان   موزوںؔ بسرور ناتوانی مسرور

جان و دل خود نثار پایش کردم   خون دل خویش را حنایش کردم
انصاف بدہ کہ کار ما بود بعشق   دشنام شنیدم و دعایش کردم

غزنوی خاندان کا وزیر حسنک

از ڈاکٹر محمد امیرالدین صدیقی، لکچرار اسلامک اسٹڈیز مسلم یونیورسٹی علی گڑھ،

سامانیوں کے دور میں نیشاپور کے دو خاندان نہایت اہم سیاسی اور علمی اقتدار کے حامل رہے ہیں۔ ان میں سے ایک سیمجوری[1] خاندان جس کا اقتدار تقریباً سو[2] سال تک قایم رہا اور اس درمیان میں انھوں نے اہم سیاسی اور فوجی خدمات انجام دیں ان کا مستقر نیشاپور تھا۔ جہاں کی حکومت اور سرداری ان ہی کے سپرد تھی۔ دوسرا خاندان آل میکال کا تھا۔ یہ اکثر سیمجوریوں سے وابستہ رہے اور سامانیوں اور غزنویوں سے بھی ان کا رابطہ رہا۔ یہ خاندان سیاسی اور فوجی اعتبار سے نہایت ممتاز تھا۔ یہ لوگ بھی نیشاپور کے رہنے والے تھے۔ اور اسی مناسبت سے ان کا ابتداءً سیمجوریوں سے بہت گہرا تعلق رہا، بعض لوگوں نے ان کا نام آل[3] میکائیل لکھا ہے

---

[1] خاندان سیمجور کا بانی ابوعمران سیمجور تھا، جو اسمٰعیل بن احمد سامانی (م ۲۹۵ھ) کے خادموں میں سے تھا، اس خاندان کا آخری رکن ابوسہل بن ابوالقاسم سیمجور ہے جس کا زوال ۳۸۸ھ میں ہوا، اس خاندان کے اقتدار کا زمانہ ۲۸۷ھ تا ۳۸۸ھ ہے، دیکھئے تاریخ بیہقی، تاریخ یمینی و ترجمہ تاریخ یمینی زین الاخبار گردیزی صفحات مختلف۔ [2] سعید نفیسی نے تعلیقات بیہقی ص ۹۲۰ میں لکھا ہے۔

[3] "نام درست این خانوادہ چنانکہ پس ازین خواہد آمد (میکالیان) است و "میکائیلیان" زیراکہ درہمہ ماخذ نام جدشان را میکال، نوشتہ اند و شعرائے کہ این خانوادہ را مدح کردہ اند نیز میکال آوردہ اند۔"

لیکن معاصر روایت سے یہ بات پوری طرح ثابت ہے کہ ان کے اس خاندان کا بانی میکال تھا جو تیسری صدی ہجری کی شخصیت ہے[1]، اس خاندان کے ممتاز اور قابل ذکر افراد میں ابونصر احمد[2] میکالی ابوقاسم علی نیشاپور کا

---

[1] سعید نفیسی نے اس خاندان کا شجرۂ نسب یہ مرتب کیا ہے،

نسب نامۂ خاندان میکالیان

بہرام گور

یزدگرد

فیروز

شورا

شور ۲

شور ۳

شور ۴ دیواستی + ۱۰۳

طرطون

بکر

قاسم

خرمک

عبدالواحد

میکال

شاہ + ۳۰۲ — محمد

عبداللہ + ۳۰۸

ابوالعباس اسمٰعیل (۲۸۰ - ۳۶۲)

عباس — رئیس ابومحمد عبداللہ (۳۰۰ - ۳۷۹) — ابوالقاسم علی مطوعی + ۳۷۶

محمد — ابوجعفر محمد — ابونصر احمد + ۳۸۰ — ابوعبداللہ حسین — ابونصر عمر — محمد

ابوعلی حسن — ابوالفضل عبداللہ — ابوالفضل عبیداللہ + ۴۳۶ — ابوابراہیم اسمٰعیل — علی

حسنک + ۴۲۲ — ابوالقاسم علی — ابوالعباس اسمٰعیل — حسین — علی — اسمٰعیل — ابوعلی الحسن — احمد — ابوحفص عمر

ابوالمظفر + ۴۴۰

حسین

ابونصر احمد

(تعلیقات بیہقی۔ ص ۱۰۰۸) [2] ۹۸۴ - ۹۸۵

حکمران تک ہوگیا تھا۔ اس کا دوسرا بھائی ابو عبداللہ حسین[1] ممتاز شخصیت کا مالک تھا۔ اور یہ وہی شخص تھا جس کا محمود غزنوی کے ابتدائی دور میں خاصا اثر اور رسوخ تھا۔ چہار مقالہ[2] میں یہ مشہور واقعہ منقول ہے کہ محمود غزنوی نے ابو العباس مامون خوارزم شاہ[3] کے پاس حکم بھیجا کہ وہ اپنے دربار کے تمام ممتاز دانشمندوں کو غزنی بھیجدے۔ محمود نے مامون کے پاس اسی عبداللہ حسین بن علی میکال کو پیغام دے کر بھیجا تھا۔ ابو الخیر خمار[4]، ابو ریحان بیرونی[5]، ابو نصر عراق[6]، ابو سہل مسیحی[7] اور ابن سینا[8] یہ سب اسی بادشاہ کے پاس تھے۔

ابو نصر احمد میکالی کا بیٹا ابو الفضل عبید اللہ[9] اپنے باپ کی طرح عربی زبان کا زبردست عالم تھا۔ اور نثر و نظم میں اس کو خاص درک حاصل تھا۔ چنانچہ تاریخ و تذکرہ کی مختلف کتابوں میں از قسم سمعانی صاحب کتاب الانساب، باخرزی صاحب دمیۃ القصر، ابو الحسن بیہقی صاحب

۱۔ دیکھئے تعلیقات بیہقی ص ۹۸۵ تا ۹۸۰، چہار مقالہ نظامی عروضی سمرقندی طبع معین ص ۱۱۸ – ۱۱۹ و تعلیقات چہار مقالہ طبع معین۔ ص ۲۲۴ – ۲۲۳ ۲۔ چہار مقالہ طبع معین۔ ص ۱۱۸ – ۱۱۹ ۳۔ یہ محمود غزنوی کا بہنوئی تھا۔ اس کے حالات کے لئے دیکھئے تاریخ بیہقی تصنیف خواجہ ابو الفضل محمد بن حسین بیہقی۔ چاپ دکتر غنی و دکتر فیاض، تہران۔ ص ۶۶۸ بعد ۴۔ چہار مقالہ طبع معین ص ۱۱۸ – ۱۱۹ و دیباچہ معین ص ۴۸ – ۴۹ تعلیقات چہار مقالہ۔ طبع معین ص ۲۱۰ – ۲۱۸ – ۱۹۰ ۵۔ دیکھئے چہار مقالہ ص ۸۶ – ۸۹ – ۹۰ ح ۹۲ – ۹۳ – ۹۴ – ۱۱۸ – ۱۱۹ تعلیقات ص ۲۴۹ – ۲۵۲ وغیرہ۔ ۶۔ دیکھئے چہار مقالہ ص ۱۱۸ – ۱۱۹ – ۱۲۰ – دیباچہ ص ۲۹ – ۹۰ تعلیقات ۲۱۹ – ۲۲۴۔ ۷۔ دیکھئے چہار مقالہ۔ ص ۱۱۰ – ۱۱۸ – ۱۱۹ – ۱۲۰ – ۱۲۱ دیباچہ ص ۴۸ – ۴۹ – ۵۰۔ تعلیقات۔ ص ۳۹۲ – ۳۹۳ – ۴۱۵ – ۴۱۶ – ۴۲۳ ۸۔ دیکھئے چہار مقالہ ص ۹۳، ۹۰، ۱۰۶، ۱۱۰، ۱۱۱، ۱۱۲، ۱۱۳، ۱۱۸، ۱۱۹، ۱۲۰، ۱۲۱، ۱۲۲، ۱۲۳، ۱۲۵ ح ۱۲۶، ۱۲۷، ۱۲۸ دیباچہ ۴۸، ۴۹، ۵۰، ۵۱، ۵۲ تعلیقات ۳۰۳، ۳۹۳، ۴۰۸، ۴۰۹، ۴۲۷، ۴۳۳، ۴۳۴، ۴۵۰، ۴۵۱ وغیرہ ۹۔ ابو الفضل عبید اللہ میکالی کے حالات و کمالات کیلئے دیکھئے تعلیقات بیہقی از سعید نفیسی ص ۹۹۰ – ۹۹۱

تاریخ بیہقی، ابن شاکر صاحب فوات الوفیات وغیرہ میں[1] اس کے حالات درج ہیں۔

آل میکال کی آخری نامور شخصیت ابو علی حسن[2] بن محمد بن عباس کی ہے۔ یہ حسنک کے نام سے زیادہ معروف ہے۔ اس نے اتنی ترقی کی کہ آخر کار ۴۱۶ھ میں محمود غزنوی کا وزیر ہوگیا، اور وزارت کے اس عہدے پر وہ محمود کی وفات تک فائز رہا۔ محمود کے دور میں اس کو بڑا تقرب حاصل ہوا، لیکن محمود کے جانشین مسعود کو اس کی طرف سے غلط فہمی ہوگئی۔ اس لئے اس کو خیال ہوا کہ خود اس کے بھائی محمد کے تخت نشین کرانے میں حسنک کا ہاتھ تھا۔ چنانچہ مسعود کے تخت نشین ہوتے ہی حسنک کے خلاف سازش شروع ہوگئی، اور اس سازش کو بروئے کار لانے میں مسعود کے وزیر ابو سہل زوزنی[3] کا بڑا ہاتھ تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا، کہ تخت نشینی کے چند ہی ماہ بعد حسنک کو پھانسی دیدی گئی، اور اس کا سر کاٹ کر خلیفۂ بغداد کو بھیجا گیا۔ اور اس کی لاش سات سال تک پھانسی کے تختے پر لٹکی رہی۔ تاریخ کا یہ المیہ ہے، چنانچہ مشہور مورخ ابو الفضل بیہقی اس واقعہ سے بہت متاثر تھا۔ اور وہ حسنک کو بیگناہ سمجھ رہا تھا۔ سارا قصور اس کے نزدیک زوزنی کا تھا۔ اگرچہ اس نے مسعود کو براہ راست ذمہ دار نہیں ٹھہرایا۔ لیکن میرا اپنا خیال ہے۔ اور شاید دوسرے محققین کی بھی یہی رائے ہو کہ خود مسعود بھی اس سے بری الذمہ نہیں ہو سکتا۔ آل میکال کا یہ نوجوان مدبر غزنوی تاریخ کا ایک اہم موضوع ہے، اس لیے اس کے بارے میں کسی قدر تفصیل سے لکھنے کی ضرورت ہے۔ اگرچہ اس کے اقتدار کا دور بہت مختصر ہے، بس محمود غزنوی کی حکومت کے آخری چند سال میں اس کی شخصیت ابھرتی ہے، اور مسعود کے تخت نشیں ہوتے ہی نہ صرف اس کے اقتدار کا خاتمہ ہوتا ہے۔ بلکہ اس کی زندگی بھی ختم ہو جاتی ہے، اور یہی چند مہینے جس میں وہ زندہ رہا۔ وہ طرح طرح کی

۱۔ تفصیل کے لیے دیکھئے تعلیقات بیہقی از سعید نفیسی ص ۹۸۸ – ۹۹۲ ۲۔ دیکھئے شجرہ خاندان۔ ۳۔ ابو سہل محمد ابن حسن زوزنی کے حالات کیلئے۔ دیکھئے تاریخ بیہقی۔ ص ۳۱، ۳۱۸ – ۳۲۰ وغیرہ۔

سازشوں کا شکار رہا۔ اور یہی سازشیں اور ان کا ذکر اس دور کے معاصر تاریخ کے اہم ابواب ہیں۔ تاریخ بیہقی[1] میں خسنک کے سیاسی اقتدار کا ذکر اس وقت ہوتا ہے، جب وہ سیستان کی بریدی پر مامور ہوا۔ یہ واقعہ سنہ ۴۲۱ھ کے کچھ قبل کا معلوم ہوتا ہے، اس لئے کہ سنہ ۴۲۱ھ میں وہ بڑے طمطراق سے سفر حج پر روانہ ہوتا ہے۔[2] خسنک کے سیستان کی حکومت پر مقرر ہونے کا ایک اہم ثبوت فرخی[3] کے ایک قصیدہ سے فراہم ہوتا ہے۔ قصیدہ کے اشعار سے معلوم ہوتا ہے کہ خسنک بڑا تجربہ کار تھا۔ اور اس کی کوششوں سے سیستان کو بڑا فروغ حاصل ہوا تھا، فرخی خود سیستانی تھا۔ اس بنا پر اس نے اس کی حکومت کا ذکر بڑی آب و تاب سے کیا ہے، اس سلسلہ کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

من قیاس از سیستان دارم کہ آن شہر منست — وز پی خویشان ز شہر خویشتن دارم خبر

شہر من شہر بزرگست و زمینش نامدار — مردمانِ شہر من در شیر مردی نامور

تا خلف[4] را خسرو ایران از آنجا برگرفت — در ستم بودند از بیداد هر بیدادگر

برکشیدند از زمین و باغها سرو و سمن — باز کردند از سرای و کاخها دیوار و در

هر سرای کان نکوتر بود و از خوشتر نمود — همچو شارستان قوم لوط شد زیر و زبر

کدخدایانشان خریده خانها بگذاشتند — زن ز شوی خویش دور افتاد و فرزند از پدر

بر شهه ایران حدیثِ سیستان پوشیده ماند — سالها بودند مسکین از غم و خون جگر

چون شهه مشرق وزارت را بخواجه باز خواند — بیشتر شغلی گرفت این شغل خواجہ بیشتر

۱؎ تاریخ بیہقی ص ۴۰۴، ۲؎ ایضاً ص ۲۰۹، ۳؎ فرخی کے دیوان میں خسنک کی مدح میں پانچ قصیدے ہیں، دیکھئے دیوان حکیم فرخی سیستانی طہران ص ۱۹۱، ۱۹۳، ۱۹۴، ۱۹۶، ۲۳۳۔ ۴؎ ابو احمد خلف سیستان میں صفاری خاندان کا آخری امیر تھا سلطان محمود غزنوی نے ۳۹۳ھ میں اسکو شکست دیکر قتل کر دیا، اور اس کے ملک کو اپنی سلطنت میں شامل کر لیا۔

عاملان را باز خواند و مردمان را بار داد — شوی باز آن گشت و زن با شوی و مادر با پسر

خانها آباد گشت و کاخها برپای شد — باخضر شد بار دیگر باغهای بی خضر

روزگار سیستان را با نکوئی عدل او — باز نشناسم همی از روزگار زال زر

از ولایت های سلطان سیستان بر گوشه است — فتنه را از گوشهٔ آن گوشه برتابید سر

شهرها بسیار دارد خواجه در زیر قلم — تو بهر شهری کنون هم زین قیاس اندر نگر

فرخی ایک دوسرے قصیدہ میں خسنک کی اس طرح تعریف کرتا ہے۔

در روزگار او وطن خویش باز یافت — پانصد هزار مردم گم گشته از وطن

فرخی کے دیوان میں خسنک کی مدح میں پانچ اور قصیدے ہیں، ان میں سے اکثر میں خسنک کے عدل، فیاضی وغیرہ یا پروری، تواضع، حلم اور بردباری کی بڑی تعریف ملتی ہے، خود شاعر بھی اس کے دربار کا نذرانہ تھا۔ ایک قصیدے کے چند شعر ملاحظہ ہوں۔

هر گنه بر گیش ز سیوم کہ جا جبش — صد تازگی نکرد و نگفت اندرون گذر

ناخوانده شعرهای دو دشمن از پی دو جشن — کین کرد نزد من کہ بیار و سمها ببر

از هجرات بجهد ستانیم سیم شعر — او نارسیده سیم بداد این کرم نگر

فرخی کا ایک قصیدہ اس وقت کا ہے۔ جب خسنک وزارت کے عہدۂ جلیلہ پر فائز ہوا تھا۔ اس کا مطلع ملاحظہ ہو۔

نیک اختیار کرد خداوند ما وزیر — زی اختیار کرد جہان سر بسر منیر[1]

خسنک کے حج پر جانے کا واقعہ اس لحاظ سے بہت اہمیت رکھتا ہے کہ اس کی وجہ سے نہ صرف اس کا زوال ہوا، بلکہ وہ موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ ابن اثیر نے تاریخ کامل[2] میں سنہ ۴۱۵ھ کے ذیل میں لکھا ہے کہ اس سال حجاج مکہ سے عراق، شام کے راستے سے آئے اسلئے کہ

۱؎ دیوان فرخی سیستانی۔ طبع طہران ص ۱۹۱، ۲؎ طبع قاہرہ ۱۹۰ ج ۹ ص ۱۲،

عام راستہ دشوار ہو گیا تھا۔ اور یہ قافلہ جب مکہ پہنچا تو ظاہر علوی قرمطی شاہ مصر نے ان کی بڑی خاطر و تواضع کی اور زر کثیر اور گرانمایہ خلعت سے نوازا اور بڑا تکلف کیا۔ اور ہر شخص جو اس گروہ میں تھا، اس کو کچھ نہ کچھ ہدیہ دیا۔ . . . . اور خراسان کے حاجیوں کا سردار یمین الدولہ ابن سبکتگین کا نائب حسنک تھا۔ اور جو کچھ ان کے ساتھ سلوک ہوا وہ خلیفہ قادر باللہ کو بہت گراں گزرا، حسنک نے دجلہ پار کیا اور خراسان گیا . . . . خلیفہ نے یمین الدولہ کے پاس پیغام بھیجا اور یمین الدولہ نے حسنک اور ان کے ساتھیوں کو جو خلعتیں ملی تھیں انھیں بغداد بھیج دیا جہاں وہ جلا دی گئیں۔ تقریباً اسی طرح کا بیان ابو الفرج ابن جوزی[1] کا ہے

ایسا اندازہ ہوتا ہے کہ خلیفۂ بغداد نے واضح طور پر حسنک پر قرمطی ہونے کا الزام عائد کیا تھا۔ اور اس کا موقف یہ تھا کہ اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ شاہ مصر کا تحفہ کیوں قبول کرتا، لیکن محمود غزنوی نے اس کو صحیح نہیں جانا اور اس کے نزدیک حسنک موردِ الزام نہ تھا، اس لئے محض اتنا کیا کہ جو تحائف حسنک کو ملے تھے وہ خلیفہ کے پاس بھیج دیئے، جہاں انھیں نذر آتش کر دیا گیا۔

تاریخ بیہقی میں ہے، جس سال حسنک کو حج جانے کا فرمان ملا وہ ۴۱۴ھ تھا اس کے اس کے ساتھ یہ بھی حکم دیا گیا کہ جب وہ نیشا پور پہنچے تو امام بو صادق تبانی[2] اور دوسروں پر نوازش کرے۔ حسنک نے حج کو جانے سے پہلے امام ابو صادق تبانی کو نوازا اور جب حج کر کے واپس ہوا تو ان کو اپنے ساتھ لے کر قدر خان کی ملاقات کو گیا۔ اس کے بعد جب حسنک امیر محمود کی خدمت میں بلخ پہنچا تو اس نے امام ابو صادق کو امیر کی خدمت میں پیش کیا، اور امیر محمود اس سے بہت خوش ہوا۔ اس کے بعد امیر محمود سومنات کی مہم پر روانہ ہوا، اور حسنک کو

۱؎ دیکھئے المنتظم فی تاریخ الملوک والامم ج ۸ چاپ حیدر آباد دکن ص ۱۶ ۲؎ دیکھئے تاریخ بیہقی ص ۲۱۰

نیشا پور کے انتظام کی طرف خصوصیت سے متوجہ کیا۔ راستہ سے محمود نے حسنک کے پاس خط بھیجا کہ ہماری واپسی پر وہ دربار میں حاضر ہو، اور امام تبانی کو بھی اپنے ساتھ لائے، حسنک نے سلطان کی غزنہ واپسی پر حسب دستور حاضری دی اور امام ابو صادق تبانی کو اپنے ساتھ لے گیا۔ امیر اس پر بہت خوش ہوا۔ اس سے واضح ہے کہ حج سے واپسی پر جو حسنک پر الزام تھا وہ سلطان کے نزدیک غلط تھا۔ بلکہ جب خلیفۂ بغداد نے حسنک کو موردِ الزام ٹھہرانے میں زیادہ اصرار کیا تو محمود کو سخت ناگواری ہوئی اور اس نے کہلا بھیجا کہ مجھے حسنک کے عقیدہ کے بارے میں شبہ نہیں، اس سے میں مدت سے واقف ہوں، اور اگر وہ قرمطی ہے، تو میں بھی قرمطی ہوں، جو لوگ محمود کے عقائد کے بارے میں واقفیت رکھتے ہیں وہ اس بات کی تصدیق کریں گے کہ محمود کو قرامطیوں سے اتنی ہی نفرت تھی جتنی خلیفۂ بغداد کو، لیکن حسنک کے بارے میں اس نے جو طرز عمل اختیار کیا، اس سے واضح ہے کہ حسنک یقیناً موردِ الزام نہ تھا، اس اختلاف کی بنا پر خلیفہ سے امیر محمود کی خط و کتابت بند ہو گئی۔[1]

محمود غزنوی کے دور کا حسنک کے تعلق سے ایک واقعہ[2] بہت مشہور ہے، اور وہ یہ ہے کہ جس وقت وہ ابو علی سیمجور[3] کی مہم پر جا رہا تھا، تو راستہ میں ایک زاہد کی خدمت میں حاضر ہوا۔ حسنک بھی اس کے ساتھ تھا۔ سلطان نے زاہد کو کچھ دینا چاہا تو زاہد نے کہا کہ مجھے کچھ درکار نہیں اور اس نے ہوا میں اپنا ہاتھ بلند کیا، اور بہت سی اشرفیاں اس کے ہاتھ میں آموجود ہوئیں۔ اس نے وہ اشرفیاں حسنک کو دیں۔ حسنک نے جب غور سے دیکھا تو وہ ابو علی سیمجور کے نام سے مزین تھیں، سلطان جب

۱؎ دیکھئے تاریخ بیہقی ص ۱۸۳ ۲؎ دیکھئے تعلیقات بیہقی ص ۱۰۰۱، اس سلسلے کی تفصیل تعلیقات میں ملتی ہے۔ ص ۹۹۷-۱۰۰۱ ۳؎ ابو علی محمد سیمجور اس خاندان کی چوتھی اہم شخصیت گذری ہے، وہ اپنے باپ ابوالحسن بن ابراہیم کے بعد ۳۷۸ھ میں خراسان کا حکمراں قرار پایا تھا۔ امیر سبکتگین نے اس کو گرفتار کر کے ملتان میں قید کر دیا تھا۔ اور بالآخر ۳۸۹ھ میں اسے قتل کر دیا۔ اس کے حالات کیلئے دیکھئے ترجمہ تاریخ یمینی ص ۶۳-۸۴ وغیرہ

زاہد کے صومعہ سے نکلا تو خنک سے سوال کیا کہ زاہد کے خوارق کے بارے میں تمھارا کیا خیال ہے
خنک نے جواب دیا کہ جو کچھ حضور کا خیال ہے وہ بالکل صحیح ہے، لیکن یہ بات مناسب نہیں ہے
کہ امیر ایک ایسے شخص سے لڑنے جائے جس کے نام کا سکہ غیب میں ڈھلتا ہے۔ پھر اس نے زاہد
کے دیے ہوئے سکہ پر درج عبارت کا ذکر سلطان سے کیا۔ مگر اس داستان کی صداقت میں بعض
محققین کو شبہ ہے[1] اور کچھ دوسرے محققین نے لکھا ہے کہ اس واقعہ میں تحریف ہوئی ہے، اور
یہ وہی واقعہ ہے، جس میں امیر محمود کے ابو الحسن خرقانی کی خدمت میں حاضری کا ذکر ہے۔

یہ چند امور ہیں، جو محمود غزنوی کے دور میں خنک سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کا خلاصہ یہ ہے
کہ خنک امیر محمود کو نہایت عزیز تھا۔ اور اسی وجہ سے اس نے اپنی وفات تک اس کو وزارت
کے عہدہ پر فائز رکھا۔

امیر محمود کے بعد کچھ دنوں کے لیے اس کا بیٹا[2] محمد غزنین کا فرمانروا ہوا۔ اس واقعہ کی
تفصیل یہ ہے کہ امیر محمد اور امیر مسعود دونوں ہم عمر تھے۔ مسعود ذہانت، طباعی اور حکومت کے
کاموں میں بڑا ہوشیار تھا۔ لیکن نہ جانے کیوں امیر محمود کی توجہ محمد کی طرف زیادہ تھی۔ بہرحال
صورت ایسی ہوئی کہ جب محمود کا انتقال ہوا تو امیر محمد گوزگانان[3] (خراسان) میں تھا۔ اور
مسعود اصفہان میں۔ امرار کا مشورہ یہ ہوا کہ مسعود کے غزنی پہنچنے میں تاخیر ہوگی، اس لیے محمد کو
جو بہت قریب ہے، بلا کے تخت نشین کرا دیا جائے، چنانچہ ایسا ہی ہوا، واضح ہے کہ اس فیصلہ
میں خنک کا مشورہ[4] شامل رہا ہوگا۔

جب مسعود کو محمد کی تخت نشینی کا حال معلوم ہوا تو دربار غزنی کے بعض امرار کے

---

[1] دیکھیے تعلیقات بیہقی۔ ص ۱۰۰۱ [2] دیکھیے تاریخ بیہقی ص ۱۰۳ حاشیہ، سعید نفیسی نے تعلیقات
بیہقی میں اس مقام کا نام جوزجانان لکھا ہے۔ ص ۱۰۲۰ [3] دیکھیے تاریخ بیہقی ص ۱

مشورہ پر وہ غزنی کے ارادہ سے چل کھڑا ہوا۔ جب وہ نیشاپور پہنچا تو ایک بڑی جماعت اس کی
خدمت میں حاضر ہوئی اور اس کو غزنی آنے کی دعوت[1] دی۔ ان ہی لوگوں میں ابو النجم ایاز[2] بھی تھا
جو ادب اور تاریخ میں محمود غزنوی اور ایاز کی رومانی داستان کا دلچسپ کردار ہے، اس درمیان میں
محمد کی ناتجربہ کاری کا امرار کو پورا یقین ہو گیا۔ اور سب لوگوں کا اتفاق اس بات پر ہوا کہ مسعود کو
تخت نشین کرایا جائے۔ چنانچہ مسعود بادشاہ منتخب ہو گیا۔ لیکن اس کے دل میں بعض ان امرار
سے جنھوں نے محمد کو تخت نشین کرایا تھا، کینہ باقی رہا۔ ان ہی میں سے خنک[3] بھی تھا۔

مسعود جب نیشاپور پہنچا تو شادیاخ کی عمارتیں جو خنک کی ملکیت تھیں اس کی قیام گاہ
قرار پائیں۔ وہاں اس نے جو امور حکومت کے سلسلے میں گفتگو کی اس سے واضح تھا کہ وہ خنک
اور آل میکال سے خوش نہ تھا۔ چنانچہ بیہقی میں ہے۔

"...... و اکنون که میفرمائیم بتعجیل، انحال تا رسمہائے خنکی نو را باطل کنند و قاعدہ[4]
کارہا بہ نشاپور در مراغعات، و جز آن همه بر رسم قدیم باز برند که آنچه خنک و قوم او میکردند
بما میرسید بدان وقت که بهرات بودیم و آن را ناپسند می بودیم اما روی گفتار نبود و آنچه کردند
خود رسید پاداش آن بد نیشان ......"

امیر مسعود نے بوسہل زوزنی کو اپنا وزیر مقرر کیا۔ یہ وزیر اگرچہ اچھے خاندان کا تھا۔ اور
صاحب علم و فضل بھی تھا۔ لیکن حد درجہ کینہ پرور اور کمینہ شخص تھا۔ وہ خنک سے سخت عداوت
رکھتا، حسب موقع اس کو بہت ذلیل کرتا۔ اور امیر سے اس کی شکایتیں کرتا رہتا تھا۔ یہاں تک کہ

---

[1] دیکھیے تاریخ بیہقی۔ ص ۳۹۔ [2] دیکھیے چہار مقالہ ص ۵۵۔ دیباچہ ص ۱، ح ۲، تعلیقات
ص ۱۵، ۱۱۶۲، ۱۱۳۱، ۴۔ [3] تاریخ بیہقی۔ ص ۴۶، ۳۶۶، ۳۶۷۔ [4] تاریخ بیہقی تصنیف خواجہ ابو الفضل
محمد بن حسین بیہقی۔ ص ۳۹۔ چاپ دکتر غنی و دکتر فیاض۔ تہران۔

امیر خنک سے حد درجہ ناخوش رہنے لگا۔ بالآخر خنک کو ابوسہل زوزنی کے نوکر علی رایض کے سپرد کیا گیا کہ وہ اس کو اپنے گھر لے جائے۔ اس نوکر نے خنک کو طرح طرح سے ذلیل کیا۔ آخر کار خنک کو پھانسی دیدی گئی۔ اور اس کے خاندان اور اس کے متعلقین کے ساتھ عبرت ناک سلوک کیا گیا۔

ابوالفضل بیہقی اس واقعہ سے بہت متاثر تھا۔ چنانچہ اس نے اس پر ایک فصل تفصیل سے لکھی ہے[1] اور اس واقعہ کو ایسے پُرزور انداز میں بیان کیا ہے کہ وہ اس کی تاریخ کا سب سے زیادہ قابل وصف اور قابل ستائش حصہ ہے۔ دراصل اس واقعہ کو لکھ کر اس نے تاریخ نویسی کا پورا پورا حق ادا کر دیا ہے۔ اس کا خلاصہ ذیل میں پیش کیا جاتا ہے۔

ابوالفضل بیہقی نے حسنک کے پھانسی دئے جانے کی تفصیل اس واقعہ کے ۲۰ سال بعد یعنی سنہ ۴۵۰ھ میں بیان کی ہے۔ اس وقت خواجہ بوسہل زوزنی فوت ہو چکا تھا اور ابوالفضل بیہقی کی عمر ۶۵ سال کی ہو چکی تھی۔ وہ لکھتا ہے کہ اگرچہ زوزنی کی حرکات سے وہ سخت نالاں تھا۔ لیکن وہ جو کچھ بیان کر رہا ہے، اس میں تعصب کا شائبہ نہیں۔

بوسہل امام زادہ، محتشم، فاضل اور ادیب تھا۔ لیکن شرارت اور کینہ جوئی اس کی طبیعت ثانیہ بن چکی تھی۔ امیر اگر کسی پر غصہ کرتا تو وہ اس کو اور بھی زیادہ ذلیل کرتا۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ بونصر مشکان[2] نہایت زیرک اور ہوشمند تھا۔ امیر محمود کے زمانہ میں وہ مسعود کی دلجوئی کرتا تھا۔ اس لئے کہ اس کے خیال میں امیر محمود کے بعد وہی وارث سلطنت ہوگا۔ خنک کا حال اس کے برخلاف تھا۔ وہ امیر محمد کی طرف زیادہ مائل تھا۔ اگرچہ بوسہل مرتبہ، دولت اور اخلاق کے اعتبار سے امیر خنک کے مقابلہ میں ایک پانی کا قطرہ تھا۔ لیکن عہدے میں اس سے

[1] تاریخ بیہقی۔ ص ۱۷۰ تا ۱۹۶ [2] ابونصر مشکان (متوفی سنہ ۴۳۱ھ) امیر محمود اور امیر مسعود کا دبیر تھا۔ اور ابوالفضل بیہقی کا استاد تھا۔ تاریخ بیہقی میں اس کا جگہ جگہ ذکر آیا ہے۔

بڑھا ہوا تھا[1]۔ بہرحال جب خنک کو بُست سے ہرات لائے تو بوسہل نے اس کو اپنے خادم علی رائض کے حوالے کیا۔ اور دنیا جانتی ہے کہ وہاں اس کے ساتھ جو بدسلوکی ہوئی اس کا بیان نہیں ہو سکتا۔ اس بنا پر لوگوں نے ابو سہل کو بہت ہی برا بھلا کہا . . .

لیکن اس کج طبع پر اس کا کچھ اثر نہ ہوا۔ جب امیر مسعود ہرات سے بلخ کی طرف گیا تو علی رائض نے خنک کو قید کر دیا۔ اور اس کے ساتھ بڑی بدسلوکی کی لیکن خود علی رائض کا بیان ہے کہ خنک کے بارے میں ابوسہل جتنا حکم دیتا اس کا وہ دسواں حصہ بھی نہیں کرتا[2]۔

امیر بلخ میں تھا۔ اور زوزنی اس پر یہی دباؤ ڈالتا تھا کہ حسنک کو پھانسی دیدینا چاہئے۔ وہ خنک کو قرمطی ثابت کرنے کے لیے ہر طرح کی جائز ناجائز دلیلیں پیش کرتا۔ امیر کے سوال پر بوسہل نے کہا کہ اس کے قتل کئے جانے پر سب سے بڑی حجت یہ ہے کہ وہ قرمطی ہے۔ مصریوں کا خلعت اس نے قبول کیا ہے۔ جس کی بنا پر امیرالمومنین القادر باللہ اس سے بیحد ناراض ہوے اور امیر محمود سے خط و کتابت بند کر دی، حضور کو یاد ہوگا۔ کہ نیشاپور میں خلیفۂ بغداد کا ایلچی آیا تھا۔ اور اس نے اس بارے میں منشور اور پیغام واضح طور پر دیا تھا۔ حضور کو خلیفہ کے فرمان کا خیال رکھنا چاہئے[3]۔

ایک روز امیر مسعود نے تنہائی میں خواجہ احمد حسن میمندی سے اس طرح اظہار خیال کیا کہ باپ کے زمانہ میں خسنک کی وجہ سے مجھکو کیا کیا پریشانیاں ہوئیں اور جب باپ کا انتقال ہو گیا تو اس نے میرے بھائی کی حمایت کر کے مجھکو کتنا صدمہ پہنچایا۔ لیکن خدا نے مجھکو حکومت سے نوازا تو میرے لیے مناسب ہے کہ میں عذر خواہوں کا عذر قبول کر دوں اور کوتاہیوں سے درگذر کروں لیکن حسنک کے اعتقاد کے بارے میں مجھے شک ہے، اس لئے کہ خلیفہ کے علی الرغم اس نے

[1] تاریخ بیہقی ص ۱۷۹ [2] تاریخ بیہقی ص ۱۸۰ [3] ایضاً

مصریوں کا خلعت قبول کیا۔ اور امیر المومنین کو آزردہ خاطر کیا۔ جس کے نتیجہ میں انھوں نے میرے باپ سے سلسلۂ مکاتبت ختم کر دیا۔ اور جس وقت ان کا ایلچی نیشاپور پہنچا تھا تو اس نے یہی پیغام دیا تھا کہ حسنک قرمطی ہے، اس کو پھانسی پر چڑھانا چاہیے[۱]۔ خواجہ احمد بن حسن میمندی[۲] نے عبدوس[۳] کے ذریعہ کہلایا کہ بوسہل زوزنی کو کیا ہوا کہ حسنک کا خون بہانے میں ایسی ایسی زیادتیاں کر رہا ہے عبدوس نے کہا کہ میں نے سنا تھا کہ ایک روز زوزنی حسنک کی وزارت کے عہد میں اس کے محل پر گیا تھا۔ تو اس کے پردہ دار نے زوزنی کے ساتھ بدسلوکی کی تھی۔ احمد حسن نے کہا کہ سبحان اللہ اتنی سی بات کی وجہ سے دل میں کینہ رکھنے کا کیا موقع۔ پھر اس نے عبدوس سے کہا کہ خداوند یعنی امیر سے کہدو کہ جس وقت میں کالنجر کے قلعہ میں محبوس تھا تو لوگوں نے میرے قتل کرنے کا پورا سامان مہیا کر لیا۔ لیکن خدا نے مجھے محفوظ رکھا۔ اس وقت میں نے نذر مانی کہ میں کسی کے قتل میں ناحق بات نہیں کرونگا[۴]

ایک روز امیر مسعود نے بونصر مشکان سے حسنک کے حج کے جانے کے سلسلے کی ساری تفصیل جاننی چاہی تو بونصر مشکان نے پوست کندہ بات کہی کہ خلیفہ کو حسنک کے مصری تحفہ قبول کرنے سے سخت ناگواری ہوئی۔ اور خلیفہ نے اسی بنا پر اس کو قرمطی قرار دیا لیکن امیر محمود غزنوی نے کہا وہ میرے بچوں کے ساتھ پڑھا پلا ہے۔ اور اگر وہ قرمطی ہے تو ہم بھی قرمطی ہیں۔ بس امیر محمود نے صرف اتنا کیا کہ وہ خلعت خلیفہ کے پاس بغداد بھیجدیا۔ جہاں اس کو جلا دیا گیا[۵]۔

۲۰ صفر ۴۲۲ھ کو ایک بڑی محفل کا انعقاد ہوا جس میں خواجہ بزرگ احمد حسن کے علاوہ

---

[۱] تاریخ بیہقی ص ۱۸۱، [۲] احمد بن حسن میمندی متوفی ۴۲۴ھ غزنوی عہد کا مشہور وزیر تھا۔ وہ بیس سال امیر محمود غزنوی اور اس کے بیٹے امیر مسعود کا وزیر رہا، دیکھئے تاریخ بیہقی ص ۶۵، ۷۷، ۷۸، ۸۳، ۹۰، ۱۴۹، ۱۵۰ وغیرہ [۳] عبدوس محمود غزنوی کا بہت بڑا افسر تھا۔ دیکھئے تاریخ بیہقی، ۵۹، ۶۱، ۸۶، ۸۸، ۹۰، ۱۰۹ وغیرہ [۴] تاریخ بیہقی ص ۱۸۱، [۵] ایضاً ص ۱۸۳۔

بوسہل زوزنی، بوالقاسم کثیر[۱] وغیرہ امرا مدعو تھے۔ حسنک کو اس میں طلب کیا گیا۔ اس کے آنے پر خواجہ بزرگ کھڑا ہو گیا۔ یہ بات بوسہل کو بہت کھلی، خواجۂ بزرگ حسنک کی طرف متوجہ ہوا اور اس سے احوال پرسی کی اور کہا دل شکستہ نہ ہونا چاہئے۔ اس طرح کے حالات زندگی میں پیش آتے ہیں، امیر جس بات کا حکم دیں اس کی بجا آوری لازمی ہے۔ بوسہل اس طرح کی گفتگو سے اتنا آزردہ خاطر ہوا کہ وہ کہہ بیٹھا کہ ایسے قرمطی کتے کی حمایت میں جو پھانسی دئے جانے کے قابل ہے، کچھ کہنا نامناسب ہے۔ خواجۂ بزرگ کو سخت غصہ آیا اور انھوں نے بوسہل پر غضبناک نظر ڈالی۔ حسنک نے فوراً بوسہل کی بات کا اس طرح جواب دیا کہ میں نہیں جانتا کہ کتا کون ہے، میرا خاندان اور جو کچھ میری دولت اور حشمت ہے، وہ سب پورے عالم کو معلوم ہے، دنیا سے ہم نے فائدہ اٹھایا۔ اور کامیابی حاصل کی، انسان کا انجام موت ہے، اگر آج موت آئی ہوئی ہے، تو مجھے پھانسی کے تختے سے کوئی نہیں بچا سکتا۔ میں حضرت امام حسین بن علیؓ سے بڑا تو نہیں ہوں۔ زوزنی جو میرے متعلق ایسا خیال رکھتے ہیں۔ ان کا حال یہ ہے کہ انھوں نے میری مدح کی ہے۔ میرے محل میں برابر آتے جاتے رہے ہیں، قرمطی کی بات ان پر زیادہ صادق آتی ہے، وہ اسی الزام میں نظر بند ہو چکے ہیں[۲]، میں اس طرح کی چیزوں سے بالکل بری الذمہ ہوں۔ اس بات سے ابوسہل کا پارہ اور چڑھ گیا، اور اس نے بلند آواز میں حسنک کو گالی دینی شروع کی۔ خواجۂ بزرگ نے اس کو ڈانٹا اور کہا کہ یہ بادشاہ کی مجلس ہے۔ اس مجلس کی حرمت کا تمھیں خیال کرنا چاہیے۔ تمھیں حسنک کے بارے میں جو کچھ کرنا ہے کر گزرو۔ لیکن شاہی محفل کے آداب کی رعایت نہایت ضروری ہے[۳]۔

بہرحال لوگوں کی ساری تدبیریں اور ساری کوششیں بے سود رہیں۔ زوزنی کا تیر نشانہ پر

---

[۱] بوالقاسم کثیر، غزنوی دور میں صاحب دیوان عرض تھا۔ دیکھئے تاریخ بیہقی ص ۱، [۲] بعد کو زوزنی محمود غزنوی کے عہد میں محبوس ہوا تھا۔ [۳] تاریخ بیہقی ص ۱۸۳ تا ۱۸۵۔

بیٹھ گیا، اور حسنک کو پھانسی کے تختے پر لٹکانے کا حکم صادر کر دیا گیا۔ حسنک کو پھانسی دیدی گئی، اور اس کا سر کاٹ کر خلیفۂ بغداد کے پاس بھیجدیا گیا اور اس کا جسم سات سال تک اسی طرح لٹکا رہا، جب حسنک کی ماں نے سنا تو عام عورتوں کی طرح اس نے آہ و فغان نہ کی بلکہ درد سے روئی یہاں تک کہ سارے لوگ خون کے آنسو روئے۔ آخر میں کہا کہ یہ میرا بیٹا حقیقتاً بزرگ تھا۔ محمود جیسے بادشاہ نے یہ دنیا اس کو دی۔ اور مسعود جیسے بادشاہ نے وہ دنیا۔[۱]

شعراء نے اس کی موت پر مرثیے لکھے۔ ایک نیشاپوری شاعر نے لکھا ہے۔

ببرید سرش را کہ سران را سر بود　آرائش دہر و ملک را افسر بود
گر قرمطی و جہود یا کافر بود　از تخت بدار بر شدن منکر بود[۲]

یہ ہے واقعہ اس شخص کا جو ایک نہایت ممتاز خاندان کا فرد تھا، اور جو اپنی ذاتی قابلیت سے ترقی کرتے کرتے وزارت کے عہدۂ جلیلہ پر فائز اور محمود جیسے فاتح بادشاہ کا دست راست ہوا، لیکن مسعود اس کو کسی طرح نہ اپنا سکا، محمود کی خواہش تھی کہ اس کے بعد اس کا بیٹا محمد تخت نشین ہو، اس بنا پر حسنک محمد کا طرفدار ہو گیا، لیکن اس میں وہ اکیلا نہ تھا، نہ جانے کتنے امراء محمد کو تخت نشین کرانے میں اس کے ساتھ تھے لیکن مسعود نے حسنک کا انتخاب کیا۔ اور اس نے ایک ایسے واقعہ کو جو آٹھ سال پہلے گذرا تھا، نئے سرے سے پیش کیا اور ابوسہل زوزنی کو آلۂ کار بنا کر حسنک کو پھانسی دیدی، غزنوی امراء میں سوائے زوزنی کے سب نے حسنک کو بچانے کی انتھک کوشش کی خصوصیت سے خواجۂ بزرگ، احمد حسن میمندی، عبدوس، بونصر مشکان وغیرہ لیکن امیر مسعود اس کی پھانسی سے کمتر پر راضی نہ تھا، بالآخر حسنک کو پھانسی دیدی گئی اور اس طرح ایک روشن فکر مدبر کی زندگی کا خاتمہ ہو گیا۔ یہ واقعہ ۴۲۲ھ کا ہے۔

---

[۱] تاریخ بیہقی ص ۱۸۲ – ۱۸۹ [۲] ایضاً ص ۱۸۹ [۳] ایضاً ص ۱۸۹

ترکوں کی مذہبی رواداری

از

جناب شیخ نذیر حسین صاحب مدیر اردو انسائیکلوپیڈیا آف اسلام لاہور

The Legacy of Islam (میراث اسلام) کا نیا ایڈیشن مسٹر جوزف شاخت[۱] اور مسٹر باسورتھ[۲] کی ادارت میں چند برس ہوئے شائع ہوا ہے، اس میں اسلامی علوم و فنون اور تہذیب و ثقافت پر متعدد مستشرقین کے مقالات ہیں۔ ان میں ایک مضمون مسٹر برنارڈ لیوس (Bernard lewis.) (لندن یونیورسٹی) نے "Politic And war" کے عنوان سے لکھا ہے، اس میں ترکوں کی مذہبی رواداری اور عیسائی رعایا سے حسن سلوک کا بلند الفاظ میں ذکر کیا ہے، قارئین معارف کی دلچسپی کے پیش نظر متعلقہ سطور کا اردو ترجمہ پیش خدمت ہے۔

اسپین سے یہودیوں کی ترکیہ کی طرف ہجرت ایک مشہور واقعہ ہے۔ اگرچہ تاریخ عالم کا کوئی انوکھا حادثہ نہیں ہے، جب عثمانی ترکوں نے یورپ سے رخت سفر باندھا، اور ان کے اقتدار کو زوال آیا تو عیسائی اقوام جن پر ترکوں نے صدیوں تک حکومت کی تھی، اپنے ملکوں میں آباد اور موجود تھیں۔ ان کے مذاہب، ان کی زبانیں اور ثقافتیں پہلے کی طرح علیٰ حالہ برقرار تھیں۔ اور اپنے علیحدہ تشخص کے اظہار کے لیے تیار ہو چکی تھیں۔

(اس کے مقابلے میں) آج اسپین اور سسلی کے باشندوں میں ایک مسلمان بھی نظر نہیں آتا۔ اور نہ کوئی عربی بولنے والا دکھائی دیتا ہے۔

مسلم اور یہودی مہاجرین کے علاوہ وہ منحرف عیسائی جو اپنی حکومتوں سے مذہبی اور سیاسی

---

[۱] Joseph sahacht [۲] C.E. Bosworth

اختلافات رکھتے تھے، ترکوں کے ہاں آکر پناہ لیتے تھے، اور ان کی رواداری اور عدل گستری سے فیضیاب ہوتے تھے۔ ترکوں کے مفتوحہ علاقوں کے کسانوں کی حالت سدھر گئی۔ لڑائی، بھڑائی اور بد انتظامی کے بجائے ملکی وحدت اور امن و امان کا دور دورہ ہوا، جس کی وجہ سے اہم سماجی اور اقتصادی تبدیلیاں رونما ہوئیں۔

ترکوں کے فتوحات کے نتیجے میں موروثی زمینداری مٹ گئی، پرانی جاگیریں ترک سپاہیوں میں تقسیم کر دی گئیں، عثمانی قانون کی رو سے نئے جاگیرداروں کو صرف مالیہ کے وصول کا حق حاصل تھا، یہ جاگیرداری دوامی اور موروثی نہ تھی، اور جب یہ جاگیردار فوجی ملازمت سے سبکدوش ہو جاتے تو یہ زمینداریاں بھی بحق سرکار ضبط کر لی جاتی تھیں۔

اس کے مقابلے میں عیسائی کاشتکاروں کو ہر طرح کا تحفظ حاصل تھا۔ عثمانی قانون کے تحت وہ موروثی کاشتکار بن گئے تھے، اور ان کی اراضیات تقسیم در تقسیم سے محفوظ تھیں۔ اب انھیں پہلے کی نسبت زیادہ آزادی اور خود مختاری حاصل تھی۔ ہمسایہ حکومتوں کے مقابلے میں عثمانی مملکت میں مالگذاری کی تشخیص کا طریقہ سیدھا سادا تھا۔ اور تحصیل وصول میں انتہائی نرمی برتی جاتی تھی۔

مال و جان کے تحفظ کی وجہ سے یہ عیسائی کاشتکار دل و جان سے عثمانی حکومت کے مطیع و فرمانبردار بن گئے۔ اس کے نتیجے میں بلقانی ریاستوں میں امن و سکون قائم رہا۔ تاآنکہ مغرب سے درآمدہ قومیت کے فتنے نے ملک کے امن کو تہ و بالا کر دیا۔ انیسویں صدی تک بلقان جانے والے عیسائی سیاح بلقانی رعایا کے کسانوں کی قناعت، امن پسندی اور خوشحالی کا ذکر کرتے ہیں، اور ہمسایہ عیسائی یورپ کے مقابلے میں ان کی حالت بہتر بتاتے ہیں، یہ فرق پندرہویں اور سولہویں صدی عیسوی میں نمایاں نظر آتا ہے جب کہ کسان یورپ میں جاگیرداروں کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔

[۱] دیوشیرمہ (لازمی بھرتی) کا قانون جس کے تحت عیسائیوں کے لڑکوں کو فوج اور سول کی ملازمت

[۱] Devshirme

کے لیے لازمی طور پر بھرتی کیا جاتا تھا، اور جس کے خلاف یورپ میں بڑی چیخ و پکار ہوتی تھی، فائدے سے خالی نہ تھا، اس طریقے سے ایک معمولی دیہاتی کا لڑکا بھی سول اور فوج کے اعلیٰ مناصب تک پہنچ جاتا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ، بہت سے دیہاتیوں کے لڑکے بڑے افسر بن گئے، ان کے خاندان کی سماجی حیثیت بھی اونچی ہو گئی، جس کا اسوقت کی عیسائی دنیا میں تصور بھی نہیں ہو سکتا تھا۔

یورپ میں عثمانی مملکت کو خطرناک دشمن سمجھا جاتا تھا، لیکن اس کے ساتھ ہی بعض لوگوں کے دلوں میں اس کے لیے بڑی کشش بھی تھی، بعض من چلے اور طالع آزما عیسائی امیر امرار ترکوں کی رواداری کی کشش سے ترکی چلے آتے تھے، مفلوک الحال اور خاک نشین کسانوں کا مرکزِ امید ان کے آقاؤں کے دشمن (ترک) بن گئے تھے۔

مارٹن لوتھر[۱] نے ۱۵۴۱ء میں ایک کتاب لکھی تھی، جس میں لوگوں کو فہمائش کی تھی کہ وہ ترکوں کو بددعا نہ دیا کریں۔ وہ اپنے ہم مذہبوں کو متنبہ کرتا ہے کہ حریص شہزادوں، ظالم جاگیرداروں اور بڑے بڑے زمینداروں کے ستائے ہوئے غریب کسان عیسائی حکومتوں کے بجائے ترکوں کی عملداری کو ترجیح دیں گے۔ ترکوں کے خلاف عیسائی جنگجو خوب لڑے۔ لیکن ان کے کسانوں اور کاشتکاروں نے جنگوں میں کوئی دلچسپی نہیں لی، مسیحیت کے بڑے بڑے حامی بھی ترکوں کی سیاسی اور فوجی صلاحیت سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے، ترکوں کے فرضی خطرے کے بارے میں یورپ میں بہت سی کتابیں لکھی گئیں۔ لیکن ان میں ترکوں کے نظم ونسق کی خوبیوں کا بھی ذکر ہے، اور ان کو اختیار کرنے کی تلقین کی گئی ہے۔

Politics & War: Bernard lewis - برنارڈ لیویس۔

در The legacy of Islam ص ۱۹۹ تا ۲۰۱ آکسفرڈ ۱۹۶۹ء

[۱] مارٹن لوتھر (۱۴۸۳ء تا ۱۵۴۶ء)، مشہور مسیحی مصلح عالم اور جرمن زبان میں کتاب مقدس کا مترجم۔

وفیات

مولوی ابوالحسن علی فراہی اصلاحی

مولوی ابوالحسن علی فراہی اصلاحی ناظم مدرسۃ الاصلاح سرائے میر کئی ماہ سے بیمار تھے. علاج کے باوجود مرض بڑھتا گیا. بالآخر ۳۱ جنوری ۱۹۸۷ء کو وقت موعود آپہنچا اور رحلت کر گئے. انا للہ وانا الیہ راجعون۔

وہ ترجمان القرآن مولانا حمید الدین فراہیؒ کے حقیقی پوتے تھے، ان کی تعلیم مدرسۃ الاصلاح کے علاوہ شبلی نیشنل کالج میں ہوئی تھی، گھر کے خوش حال تھے، اسلئے کوئی ملازمت کرنے کے بجائے زمین اور زمینداری کی دیکھ بھال کرتے رہے، لیکن قومی و ملی کاموں سے دلچسپی تھی، تقسیم کے زمانہ میں جمعیۃ علماء اور کانگریس کے پرجوش حامی تھے، تقسیم کے بعد صوبہ کانگریس کے ممبر بھی ہوئے پھر پرانے کانگریسیوں کی طرح اس سے دل برداشتہ ہو کر لوک دل میں چلے گئے مگر اس سے بھی نباہ نہ ہو سکا اور اب سیاسی جھمیلوں سے الگ ہو کر صرف مدرسۃ الاصلاح کی خدمت کیلئے وقف ہو گئے تھے جس سے اپنے دادا کی یادگار ہونے کی بنا پر ہمیشہ بہت تعلق رکھا، پہلے اسکے نائب ناظم ہوئے اور اب کئی برس سے ناظم ہو گئے تھے۔

وہ جس اخلاص، ایثار اور قربانی سے کسی معاوضہ کے بغیر مدرسہ کی خدمت انجام دے رہے تھے، اسکی مثال کسی دینی مدرسہ میں کم ہی ملے گی، انکے دور میں مدرسہ میں کئی عمارتیں تعمیر ہوئیں اور بعض مفید کام بھی انجام پائے، یہاں انکے دادا کی یاد میں دائرہ حمیدیہ قائم ہوا تھا جسکو متحرک بنانے کے بڑے خواہشمند تھے، مرحوم کو دارالمصنفین سے بھی گہرا لگاؤ تھا، انکے دادا مولانا حمید الدین فراہیؒ کی سرپرستی میں اسکا آغاز ہوا تھا، انکے بعد انکے چھوٹے بھائی مولوی حاجی رشید الدین فراہی کو بھی اس ادارہ سے بڑی دلچسپی اور ہمدردی رہی۔

مرحوم مرنجاں مرنج شخص تھے، طبیعت میں سادگی، قناعت اور انکسار کے ساتھ بڑا صبر و تحمل اور بردباری تھی اپنی ان خوبیوں کی وجہ سے مقبول اور ہر دلعزیز تھے جسکا اندازہ انکے جنازے سے بھی ہوا جس میں بڑی تعداد مسلمانوں کے ساتھ غیر مسلم بھی شریک تھے، اللہ تعالیٰ انکو غریق رحمت کرے اور پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے،

"ض"

مطبوعات جدیدہ

رسالوں کے خاص نمبر اور نئے رسالے

ذکر و فکر :- مرتبہ خواجہ احمد فاروقی صاحب، تقطیع متوسط، کاغذ، کتابت و طباعت عمدہ، صفحات ۴۸ قیمت سالانہ ۵۰ روپے، غیر ممالک سے ۲۰ ڈالر یا اس کے مساوی سکہ، پتہ - محمد شبیر ندوی ۱۰ - سی - ابوالفضل، ڈاکخانہ، جامعہ نگر، نئی دہلی - ۱۱۰۰۲۵ -

اس ماہنامہ کا ابھی پہلا شمارہ شائع ہوا ہے، اس میں پہلے مقالات، جائزے اور تحقیقات کے زیر عنوان مذہبی و علمی مضامین پیش کئے گئے ہیں، پہلا مضمون علامہ ابن قیمؒ کی شہرۂ آفاق تصنیف اعلام الموقعین کے ایک ٹکڑے کا ترجمہ ہے، اس میں نہی عن المنکر کے حدود بیان کرکے بتایا گیا ہے کہ بعض موقعوں پر اسکی تعمیل مضرت رساں ہوتی ہے، اور لوگ اسکی وجہ سے مشکلات میں پڑ جاتے ہیں، اس سلسلہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی اور عمل سے متعدد مثالیں پیش کی گئی ہیں، دوسرے مضمون میں مختلف ملکوں میں دینی شعور کی بیداری، اس کے اسباب اور ردعمل وغیرہ کا ذکر ہے، تیسرے مضمون میں عالم اسلام کی عددی قوت و وسعت، ان کی زرخیزی و خوشحالی، اور قدرتی ذخائر و وسائل کی فراوانی وغیرہ کو بیان کرکے یہ لکھا اور بتایا ہے کہ عالم اسلام کو دنیا کی تیسری بڑی قوت کا درجہ حاصل ہے، مگر اس سلسلہ میں دنیا کی بڑی طاقتوں کی ریشہ دوانیوں اور مسلم ممالک کے لیڈروں کی بے حسی اور غفلت کا تذکرہ بھی کیا ہے۔ چوتھے مضمون میں معرفتِ نفس میں مغرب کی ناکامی کی داستان ایک مشہور فرانسیسی مفکر اور نومسلم کی زبانی سنائی ہے، ایک اور مضمون میں عالم عرب کی موجودہ ثقافتی سرگرمیوں اور علمی خبروں کا ذکر ہے، یہ سب

مضامین مفید اور معلوماتی ہیں۔ دوسرا حصہ ادبیات پر مشتمل ہے، اس میں ایک نعت کے علاوہ ڈاکٹر سید طٰہٰ عبداللہ کے قلم سے ایک دلچسپ مضمون "حواشی دریابادی" شامل ہے، اس سے مولانا عبدالماجد دریابادی کی جادو نگاری، ایجاز، حاضر جوابی، برجستگی، تلمیح اور ضلع جگت وغیرہ میں مہارت کا پتہ چلتا ہے۔ رسالہ صوری و معنوی حیثیت سے بہت دلکش اور پاکیزہ ہے، اور یہ حسن اتفاق ہے کہ اس کی اشاعت ماہ ربیع الاول میں ہوئی، جو لفظاً و معناً بہار کا مہینہ ہے، اس کی ادارت خواجہ احمد فاروقی کے حصہ میں آئی ہے، ان کا مختصر افتتاحیہ ان کی انشاء پردازی اور حسن بیان کا دلکش نمونہ ہے، خواجہ صاحب کے ساتھ ان کی مجلس ادارت کے ارکان جناب سید صباح الدین عبدالرحمٰن، پروفیسر خلیق احمد نظامی اور ڈاکٹر عبداللہ عباس کی حیثیت نور علیٰ نور کی ہے، ڈاکٹر عبداللہ عباس عربی کی طرح اردو ادب و انشاء کا بھی نہایت پاکیزہ ذوق رکھتے ہیں، رسالہ کی ترتیب، تزئین، نفاست اور دلکشی میں ان کی مساعی جمیلہ کو بڑا دخل ہے، پہلا افتتاحیہ ان ہی کے قلم سے ہے، اس میں رسالہ کے مقصد آغاز کے وقت مجلس ادارت اور مولانا محمد عمران خاں ندوی کے سانحۂ وفات پر جس خوبی، سلاست اور ماتمی و مادلی انداز میں اظہار خیال کیا ہے۔ اس سے ان کی شگفتگی اور حسن تحریر کا ایک چمنستان آباد ہو گیا ہے جس کو پڑھ کر روح وجد کرنے لگتی ہے، رسالہ کا نام خود ہی اس کے مقصد کی مکمل غمازی کرتا ہے، دراصل ذکر و فکر کے امتزاج و اعتدال ہی سے ملت کے مقدر کا ستارہ چمک سکتا ہے، یہ نوخیز رسالہ جن لوگوں کے ہاتھوں میں ہے، وہ ضرور اس اعتدال کو ہوشمندی سے قائم رکھیں گے، ہم اس کی بقا کی دعا کرتے ہیں۔

نقوش: مرتبہ جناب جاوید طفیل صاحب، تقطیع کلاں، کاغذ کتابت و طباعت عمدہ، صفحات ۶۹۶ مع جاذب نظر ٹائٹل، قیمت ۱۰۰ روپیہ، پتہ: ادارۂ فروغ اردو، ۱۱ ایبک روڈ، انار کلی، لاہور (پاکستان)

نقوش اور صاحب نقوش جناب محمد طفیل مرحوم سے ہر اردو داں واقف ہے، انھوں نے اردو میں

بالکل نئے طرز کے خاکے لکھ کر اور اس سے بڑھ کر یہ کہ نقوش کے کئی درجن ضخیم، معیاری اور یادگار خاص نمبر شائع کر کے اردو زبان کے ہر عاشق و شیدائی کو اپنی جانب متوجہ کر لیا، جناب محمد طفیل کا خاتمہ بالخیر نقوش کے رسول نمبر کی تیرہ جلدوں کی اشاعت کے بعد ہوا، ان کے انتقال کے بعد خیال تھا کہ نقوش اب اس آب و تاب اور شان و اہتمام سے شائع نہ ہو سکے گا، اور خاص نمبروں کی اشاعت کا سلسلہ بھی موقوف ہو جائے گا، جن میں اردو کا کوئی بھی رسالہ اس کی ہمسری نہیں کر سکتا، لیکن نقوش کا ۱۳۴واں شمارہ (دسمبر ۱۹۸۶ء) دیکھ کر یہ خیال غلط نکلا اور معلوم ہوا کہ جناب جاوید طفیل الولد سر لابیہ کا مصداق ہیں، چنانچہ انھوں نے اپنے والد مرحوم کی اس علمی و ادبی یادگار کو نہ صرف اسی آن بان اور سج دھج کے ساتھ باقی اور جاری رکھا ہے، بلکہ اس کا بھی تہیہ کئے ہوئے ہیں کہ نقوش کے شاندار، ضخیم اور بلند پایہ نمبر بھی شائع کرتے رہیں گے، زیر نظر شمارہ کے مندرجات مختلف عنوانات کے تحت دئے گئے ہیں، پہلے حصہ "مقالے" میں علمی، ادبی، تحقیقی اور تنقیدی نوعیت کے گیارہ مضامین ہیں، جو تقریباً سوا دو سو صفحات کو محیط ہیں، پہلا مقالہ "فورٹ ولیم کالج۔ کچھ قابل ذکر ماخذ، کچھ معلومات" ڈاکٹر نجم الاسلام، بڑی تحقیق و محنت سے لکھا گیا ہے، اور اس میں کالج کے متعلق بعض مفید اور نئے معلومات پیش کئے گئے ہیں، لیکن اس کے شروع میں تحریر کیا گیا ہے کہ "ابھی تک اردو زبان میں اس ادارے کی کوئی مستقل مبسوط اور جامع تاریخ منظر عام پر نہیں آئی ہے" یہ صحیح نہیں ہے، ڈاکٹر عبیدہ بیگم نے اس پر تحقیقی مقالہ لکھ کر لکھنؤ یونیورسٹی سے پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری لی تھی، اور ان کا یہ مقالہ ۱۹۸۳ء میں کتابی صورت میں بھی چھپ چکا ہے، اس میں ضروری اور متعلق ماخذ سے فائدہ اٹھایا گیا ہے، اور اس سے کالج کے بعض اہم گوشے سامنے آگئے ہیں، معلوم ہوتا ہے کہ پاکستان تک ابھی یہ کتاب نہیں پہنچی ہے، دوسرا اہم مضمون "اردو کی ادبی نثر کی اصناف" ڈاکٹر گیان چند جین کا ہے، اس میں نظم و نثر کا فرق بتا کر لکھا ہے کہ اردو میں اقسام نثر کا بیان تو ہوا ہے لیکن اصناف نثر کا نہیں ہوا ہے، پھر اصل موضوع پر دقت نظر اور تحقیق سے معلومات افزا بحث کی ہے، ایک بڑا دلچسپ مضمون "نیاز مندان لاہور اور ان کا حلقہ اثر"

(ڈاکٹر آفتاب احمد) ہے، اس میں عبدالمجید سالک، پطرس بخاری، دین محمد تاثیر، مجید ملک، سید امتیاز علی تاج، صوفی غلام مصطفےٰ تبسم، ابوالاثر حفیظ جالندھری، عبدالرحمٰن چغتائی، چراغ حسن حسرت اور ہری چند اختر وغیرہ کے واقعات، ادبی سرگذشت اور دلچسپیوں وغیرہ کا تذکرہ ہے۔ "سفر نقوش اور محمد نقوش (جاوید طفیل)" میں نقوش کے تعلق سے محمد طفیل مرحوم کے کارناموں کا مختصر تذکرہ ہے۔ "علامہ سید سلیمان ندوی اور ریاست بھوپال" (عبدالقوی دسنوی) بھی سیر حاصل مقالہ ہے، جو بزم سلیمان بھوپال کے مجموعہ "مطالعہ سلیمانی" میں بھی شامل ہے۔ ان کے علاوہ "عزیز احمد کی تاریخی کہانیاں" (ڈاکٹر مرزا حامد بیگ)، "ادا جعفری آج کی شاعری کا ایک معتبر نام" (ڈاکٹر فرمان فتح پوری) اور "ابوالقاسم لاہوتی۔ ایک مطالعہ" (کبیر احمد جائسی) بھی اچھے مضامین ہیں اور تلاش و محنت سے لکھے گئے ہیں، مقالات کے بعد ایک سکشن محمد حسن لطیفی کے لیے خاص ہے، اس میں ان کے حالات اور شعری و ادبی خدمات پر مضامین کے علاوہ ان کے نام کے ڈاکٹر محمد اقبال، ن۔ م۔ راشد اور اختر شیرانی کے کئی خطوط کا عکس بھی دیا گیا ہے، پھر افسانوں کا حصہ شروع ہوتا ہے، جو دو حصوں میں ہے، ایک میں خواتین کے چھ افسانے دے گئے ہیں، اور دوسرے میں مرد افسانہ نگاروں کے نو افسانے ہیں، ان حصوں میں ہاجرہ مسرور، جیلانی بانو، ممتاز مفتی، میرزا ادیب اور رام لعل وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں، پھر تین ڈرامے اور چار خاکے ہیں، ایک "خاکہ نمبر دو صاحب" جناب محمد طفیل کے قلم سے ہے، نثری نگارشات کے بعد منظومات کا حصہ شروع ہوتا ہے، اس میں پہلے ایک بہت انوکھے طرز و انداز کے پاکستانی شاعر عبدالعزیز خالد کا گوشہ ہے، جس میں ان کے کلام کے مختلف اصناف کے نمونے پیش کیے گئے ہیں، پھر ایک حصہ میں حمد و نعت سے متعلق مختلف شعرا کا کلام درج ہے، اور آخر میں نظموں اور غزلوں کا حصہ ہے، جن کی تعداد ۹۰ ہے، اس میں فضا ابن فیضی، نعیم صدیقی، احمد ندیم قاسمی، قتیل شفائی، مجروح، شان الحق حقی، علی احمد جلیلی، بشیر بدر، مظفر حنفی، کوثر نیازی، ممتاز مرزا، اکبر کاظمی، تحسین فراقی، ڈاکٹر طارق عزیز اور دوسرے متعدد شعرا کی نگارشات پیش کی گئی ہیں

نقوش کا عام شمارہ ہے جو تقریباً .. صفحات پر مشتمل متنوع ادبی مضامین و منظومات کا ایک بڑا ذخیرہ ہے، جس سے ہر ذوق و طبیعت کے لوگ فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔

نیا دور اندرا گاندھی نمبر: مرتبہ جناب امیر احمد صدیقی و شاہ نواز قریشی، تقطیع کلاں، کاغذ کتابت و طباعت بہت عمدہ، صفحات ۲۴۸، قیمت تین روپے، پتہ۔ اردو ماہنامہ نیا دور پوسٹ باکس نمبر ۱۴۶، لکھنؤ۔

محکمہ اطلاعات حکومت اتر پردیش کا اردو ماہنامہ نیا دور ضخیم اور اچھے نمبروں کی اشاعت کے لیے بہت ممتاز ہے، یہ خاص نمبر ہندوستان کی سابق وزیر اعظم مسز اندرا گاندھی کے حالات کا مرقع ہے، اس میں ان کی شخصیت و سیرت کے گوناگوں پہلوؤں اور رخوں کو نمایاں کیا گیا ہے، شروع میں صدر، وزیر اعظم، گورنر اتر پردیش، اور دوسرے مرکزی و صوبائی وزرا کے پیغام دیئے گئے ہیں، پھر متعدد دلچسپ اور پرکشش عنوانات کے تحت مختلف ارباب قلم کے مضامین نظم و نثر بہت سلیقہ اور خوش مذاقی کے مرتب کیے گئے ہیں (۱) تاثرات و احساسات کے آئینے میں (۲) اک تو نہیں تو سارا زمانہ اداس ہے (۳) قلمیں اور اندرا گاندھی (۴) اردو سے لگاؤ اور دلچسپی (۵) یک جہتی اور عالمی امن کی علمبردار (۶) ذات و صفات (۷) شخصیت و بصیرت (۸) بات چیت اور انٹرویو (۹) روشنی فکر (۱۰) سائنس سے لگاؤ، (۱۱) گلاب، چنار، خوشبو (۱۲) ملاقاتیں، (۱۳) یادوں کے پس منظر میں، (۱۴) سوانح (۱۵) اک شعلہ تھی کہ ساتھ گئی آفتاب کے، ان عنوانات سے اس نمبر کے تنوع، دلکشی اور مرتبین کی محنت و سلیقہ کا پتہ چلتا ہے، گو اندرا جی کی شخصیت بعض حلقوں میں متنازعہ رہی ہے، اس کی وجہ سے ممکن ہے بعض مضامین میں مبالغہ نظر آئے، مگر ان کی عظمت اور ملک و وطن کی تعمیر و ترقی میں نمایاں خدمت مسلّم ہے، اور آخر میں انھیں جس وحشیانہ انداز سے قتل کیا گیا اس سے پورا ملک تڑپ اٹھا، اس نمبر میں ملک کی اس عظیم شخصیت کو خراج عقیدت پیش کرنے کے لیے اتنے سارے مضامین کو اکٹھا کرکے اس قدر قرینہ سے

پیش کرنا بڑا کام ہے، یہ نمبر اندرا گاندھی اور ان کے خاندان کے دوسرے افراد کی متعدد تصویروں سے بھی مزین ہے۔

ششماہی مجلہ علوم القرآن، مرتبہ ڈاکٹر اشتیاق احمد ظلی، تقطیع متوسط، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، صفحات ۲۲، قیمت سالانہ ہندوستان سے ۲۵ روپے، دیگر ممالک سے ۸ ڈالر، پتہ - ادارہ علوم القرآن، پوسٹ بکس نمبر ۹۹، نیو سرسید نگر، علی گڑھ۔

یہ نیا ششماہی مجلہ علی گڑھ کی زرخیز علمی سرزمین سے نکلا ہے، جو صرف قرآنی علوم و معارف کی بحث و تحقیق، قرآن مجید میں غور و فکر کرنے والوں کے حالات و خدمات، کتب تفسیر کی خصوصیات اور اہم مفسرین کے مناہج فکر کے مطالعہ و تجزیہ کیلئے جاری کیا گیا ہے، اس رسالہ کے دو شمارے شائع ہو چکے ہیں اور ان میں صرف قرآنی موضوعات پر سنجیدہ اور پر مغز مضامین شائع کئے گئے ہیں، پہلے شمارہ کی ابتدا مولانا امین احسن اصلاحی کے ایک تازہ مضمون سے ہوئی ہے، انھوں نے قرآن مجید کی روشنی میں ایمان و اسلام کو لازم و ملزوم قرار دیکر اعمال صالحہ کو ایمان کے برگ و بار بتایا ہے اور ایمان و اسلام کے جامد ہونے کی نفی کر کے قرآن مجید سے ثابت کیا ہے کہ کن لوگوں کے ایمان میں افزونی و برکت ہوتی ہے، اس سلسلہ میں امام ابو حنیفہؒ کے قول کا صحیح محل بھی متعین کیا ہے، اس شمارہ کا اہم مضمون وہ ہے جس میں ڈاکٹر محمد اجمل اصلاحی نے مولانا فراہیؒ کے وہ حواشی جمع کئے ہیں، جو انھوں نے علامہ سیوطی کی مشہور تصنیف الاتقان فی علوم القرآن پر لکھے تھے، مضمون نگار نے پہلے علامہ سیوطی کا خیال نقل کیا ہے، پھر اس پر مولانا کا تائیدی یا تنقیدی حاشیہ درج کیا ہے، ڈاکٹر محمد اجمل نے جامعۃ الامام محمد بن سعود الاسلامیہ ریاض میں قرآنی مخطوطات پر ہونے والے ایم۔ اے اور پی۔ ایچ۔ ڈی کے تحقیقی مطالعہ کی فہرست بھی دی ہے، ڈاکٹر شرف الدین اصلاحی نے قرآنیات کے مشہور عالم مولانا حمید الدین فراہیؒ کی جائے پیدائش کے بارہ میں بڑی کد و کاوش کی ہے، ڈاکٹر ظفر الاسلام نے ہندوستان کے عہد وسطیٰ کی فارسی تفسیروں کا اجمالی تعارف کرایا ہے، اس میں تفسیروں کی اہم خصوصیات اور مفسرین کے مختصر حالات کے علاوہ تفسیروں کے سن تصنیف اور مطبوعہ یا مخطوطہ ہونے کی صراحت بھی کی ہے، تبصرہ کے کالم میں ڈاکٹر عبدالرحیم قدوائی نے تفسیر ماجدی انگریزی کی بعض خصوصیات دکھائی ہیں، اس شمارہ کے دوسرے مضامین بھی مفید اور اچھے ہیں، دوسرا شمارہ بھی قرآنی مضامین کے لئے مخصوص ہے، اس میں راقم نے مولانا سید سلیمان ندوی کی سیرۃ النبی جلد سوم کی روشنی میں قرآنی معجزات پر گفتگو کی ہے، یہ رسالہ محض قرآن مجید کی خدمت کے جذبہ سے شائع کیا گیا ہے، اللہ تعالیٰ اس کو قائم و باقی رکھے۔ "ض"

جلد ۱۳۹ ماہ رجب المرجب ۱۴۰۷ھ مطابق ماہ مارچ ۱۹۸۷ء عدد ۳

مضامین

مقالات